گلِ مصلوب

(افسانے)

سبین علی

سبین کے لئے لکھنے بیٹھی تو ایک مسئلہ یہ درپیش رہا کہ لکھتی تو لکھتی ہی چلی جاتی جبکہ مجھے صرف چند الفاظ لکھنے تھے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ میں فیس بک کے ایک افسانہ فورم پر سبین کے بے ساختہ تبصروں کو پڑھ کے اُس کی تنقیدی بصیرت کی قائل اور اُس کے افسانوں کو پڑھ کے اس کے تخلیقی رچاؤ، شدت فکر کی گہرائی، ندرت خیال اور موضوع کا متن میں پھیلاؤ، نبھاؤ اور سلیقہ مندی کی گھائل رہی ہوں۔ سبین کے افسانے زندگی کی حقیقتوں سے سرشار ہیں۔ اسکی ذہانت، فکری نکتہ رسی، تخلیقی شائستگی و وارفتگی میں ایسا والہانہ امتزاج و نامیاتی وحدت قائم کرتی ہے کہ سب ایک اکائی میں ڈھل کے اس کے افسانوں کو اس کی شناخت بنا دیتے ہیں۔ متن کی معنیاتی گہرائی اور چست بیانیہ اس کے علامتی افسانوں کو بھی وہ گورکھ دھندا نہیں بننے دیتے جس پڑھنے کے بجائے بوجھنا پڑتا ہے اور لطف اندوز ہونے کے بجائے قاری خود اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ادب کی دنیا میں کسی تخلیق کار کی اولین تخلیقات کے لئے کوئی پیشن گوئی مناسب نہیں مانی جاتی لیکن ادب کی تاریخ اس کی بھی گواہ ہے کہ اولین فن پارہ ہی قبول ورد کا واضع اشارہ بھی متعین کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سبین علی فکشن کی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرنے جا رہی ہیں اس اوّلین پیشکش کے ساتھ اور آنے والا وقت بہت جلد اس کی تصدیق کرے گا۔

نسیم سید

(افسانے)

سبین علی

عکس

AKSPUBLICATIONS

کتاب گلِ مصلوب

مصنفہ سبین علی

سن طباعت 2019ء

تعداد 600

قیمت 500

website:
sabeenaliblog.wordpress.com

انتساب

ظفر کے نام

فہرست

گُلوں سے حرف کروں

اپنی پہلی کتاب کے ساتھ قارئین سے ہم کلام ہوں۔ پہلی تحریر اور پہلی کتاب موسم کی پہلی بارش جیسی ہوتی ہے موسموں کو بدل دینے والی، روئیدگی بخشنے والی یا خزاں کے موسم میں برگ و بار کے رنگ بدل دینے والی۔ لفظ میرے لیے عطا کی مانند ہیں۔ بارش کی مانند شعور کے پردے پر اترتے ہیں۔ اور پھر انگلیوں کی پوروں سے برقی صفحات پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ الفاظ مہاجر پرندوں کی مانند ڈال ڈال اترنے لگتے ہیں اور تہ بہ تہ اپنے سینوں میں چھپائے بھید کھولنے لگتے ہیں۔

آخر ہم لکھتے کیوں ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جو کبھی نہ کبھی ہر مصنف سے پوچھا جاتا ہے اور کئی بار ہم ادیب خود سے بھی یہ سوال کرتے ہیں اور ہر ادیب یا مصنف کے پاس اس کے الگ الگ جوابات یا توجیہات ہو سکتی ہیں۔ قارئین سے مصنّفین جو کہنا چاہتے ہیں وہ تو افسانوں اور کہانیوں میں موجود ہوتا ہے لیکن بہت سے لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر لکھنے کا محرک کیا ہے، لفظ کیوں بنتے ہیں، حرف کیوں جڑتے ہیں؟ محرک سے قطع نظر اس بننے جڑنے کے عمل میں ہمارے وجود کے سنگریزے بھی ریزہ ریزہ ہماری تخلیقات، ہماری تحریروں میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور علم ہی نہیں ہو پاتا کہ ہم کب لکھنے لگتے ہیں کب مصنّفین میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ تحریر کو ہم ڈھالتے ہیں اور تحریر

ہمیں ڈھال رہی ہوتی ہے۔ ہر نیا تخلیقی تجربہ ہمارے اندر ایک نئی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔شاخِ گُل کے پھوٹنے، کِھلنے اور کِھل کر بکھر جانے کا عمل فطرت کا طے شدہ امر ہے اور کبھی نہ کبھی ہم سب اپنی اپنی فطرت کے بنائے گئے راستوں پر ہو لیتے ہیں۔ فقط ایک قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد فطرت خود اُس راہ کی جانب ہمیں لے چلتی ہے۔ راستے خود ہی نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میری والدہ معلمہ تھیں۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ ہماری والدہ نے اپنے سبھی بچوں میں کتب بینی کا شوق ابھارا۔ ہر بچے کو اس کے ذوق کے مطابق کتب خرید کر دیتیں۔ خواہ کوئی ناول پڑھے یا شاعری، تاریخی کتب پڑھے یا انگریزی ادب سب کی ہمت افزائی کرتیں۔ بہت کم سنی میں والدہ کی کتب میں سے سعدی اور رومی کو پڑھا تھا۔ والد اور والدہ دونوں مطالعہ کے شوقین تھے۔ ان کی کتب میں اردو اور فارسی کی کئی کلاسیک کتابیں تھیں اس کے علاوہ ناول، تاریخ اور تصوف کی کتب بھی تھیں۔

گھر کے ماحول کی بنا پر سکول کی ابتدائی تعلیم سے قبل پڑھنا سیکھ لیا تھا اسی طرح لکھنے کا شوق بھی خداداد ہی ہے۔ میرے لیے لکھنا بہت حد تک ایک خود کار عمل جیسا ہے۔ کئی بار لکھتے وقت ہاتھ کی پوروں کو بھی علم نہیں ہو پاتا کہ وہ اگلا لفظ کیا لکھیں گی، لفظ خود بخود امڈتے چلے آتے ہیں۔ اور کئی بار لکھنے سے قبل سوچتی ہوں کہ کیا لکھوں؟ کس کردار یا کہانی کو قرطاس پر اتاروں۔ علم وادب سے گہرے لگاؤ کے باوجود باقاعدہ لکھنے کی جانب کبھی توجہ نہ دی تھی۔ لکھنا اس وقت شروع کیا جب اپنی والدہ کی وفات کے بعد ایک عجیب سی بے کلی نے گھیر لیا۔ پہلے ان سے اپنے ہر طرح کے خیالات کا اظہار کیا کرتی تھی، ہر موضوع پر مباحث ہوتے شعور اور لاشعور کی بھی تشنگی سیراب ہوتی رہتی۔ مگر ان کے انتقال کے بعد ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ اپنی والدہ کی شخصیت جیسی شخصیت کبھی میرے مشاہدے میں نہیں آئی وہ بہت عالم فاضل، رحم دل بہت مدبر و صابر، گفتار

کی بجائے عمل پر یقین رکھنے والی اور علم دوست انسان تھیں جو لڑکیوں کی تعلیم اور حقوق کے لیے عملی کوشش کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ باتیں وہ مکالمے جو والدہ سے کرتی تھی انھیں کبھی کبھی اپنی تحریر کا حصہ بنانا شروع کر دیا۔ ایسے میں ایک دن ان کی یادداشتوں کو جمع کر رہی تھی کہ ایک پرانی تحریر نظر سے گزری جس میں امی جی نے لکھا تھا کہ بیٹیوں اور لڑکیوں کو مائیں ناول پڑھنے سے روکتی ہیں جو کہ بہت غلط رجحان ہے جبکہ کچھ ناول تو انسانی زندگی کو ہی بدل ڈالتے ہیں۔ ایسے میں اُس بے کلی کو گویا قرار سا آ گیا۔ اس دن طے کیا کہ اب لکھا کروں گی۔ اور اپنے خیالات کو تحریر کے سانچے میں ڈھالا کروں گی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہر انسان کا بھی میٹا مارفوسس ہوتا ہے، وقت ہماری تجسیم کرتا ہے ہمیں نئے خدوخال عطا کرتا ہے، بناتا ہے بگاڑتا ہے۔ لکھنے کا آغاز ہوا تو اس وقت میری دیرینہ سہیلی اور مصنفہ سیمین نے مجھے ابھارا کہ باقاعدہ فکشن لکھنا شروع کروں۔ بالکل آغاز میں ہی لکھے افسانوں کو ادبی حلقوں میں پزیرائی ملی اور بہت سے اساتذہ فن اور ہم عصر دوست ادیبوں نے خوب ہمت بڑھائی پس لکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے لکھنا ایسے ہی بن گیا ہے جیسے سانس لینا، یاد کرنا اور جینا۔ اسی دوران سلمیٰ جیلانی اور نسترن فتیحی کے ساتھ مل کر ادبی جریدے دیدبان کا اجرا بھی کیا۔ اس علمی و ادبی سفر میں جس کا بیج والدہ نے بویا تھا اسے پروان چڑھانے میں میرے گھر والوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شوہر اور بچوں کی جانب سے ملنے والا تعاون، ذہنی یکسوئی اور جب کبھی منفی ادبی رویوں سے اکتا کر لکھنا کم کرتی ہوں تو ان کا لکھنے پر اصرار اور حوصلہ بڑھاتے رہنا ہی میری اصل طاقت ہے۔

جدہ میں پندرہ برس قیام کے بعد پاکستان واپس لوٹی تو تین کتب کے مسودے تیار تھے مگر اشاعت کی بابت سنجیدگی سے سوچا ہی نہ تھا۔ پچھلے دنوں کتاب محل کے محمد فہد صاحب نے میری کتب کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک دن ان کا پیغام ملا کہ اپنی کسی

کتاب کا مسودہ بھیجئے۔ اس طرح محمد فہد صاحب کی مساعی سے یہ کتاب قارئین تک پہنچنے جا رہی ہے۔ رب باری تعالی کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان تمام لوگوں کی بھی شکر گزار ہوں جن کا کسی بھی مقام پر تعاون حاصل رہا۔

سبین علی

لاہور

۳۰/اکتوبر ۲۰۱۸ء

نیّر حیات قاسمی

پیش لفظ

''گُلِ مصلوب ــــ از، سبین علی''

گفتگو، بیان، قصے، کہانیاں اور بات چیت انسان کی موجودگی کی نشانیاں ہیں۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے انسان کو''حرف'' کی نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بولنے کی طاقت تو دیگر جانداروں کے پاس بھی ہے مگر حرف کی طاقت نہیں۔ انسان نے اسی حرف سے لفظ بنائے، لفظوں سے جملے بُنے، جملوں سے زبان اور مختلف زبانوں کے ملاپ سے نئی زبانیں وجود میں آئیں۔ زبانیں نہ صرف گفتگو کا وسیلہ ہیں بلکہ شعر و نثر، علم و ادب کی ترویج کا باعث بھی ہیں۔ معاشرے کے ارتقائی عمل کے ساتھ چلتے چلتے مختلف زبانوں میں ادب تشکیل پاتا جاتا ہے۔ ادب کسی بھی معاشرے کی عمومی فکر، سوچ اور صورتِ حال کا مظہر ہوتا ہے۔ لہٰذا حرف سے شروع ہونے والے عمل کے نتیجے میں دراصل ایک ''چین ری ایکشن۔ Chain reaction'' کی ابتدا ہوتی ہے جس میں لفظ ایک دوسرے سے جڑتے جاتے ہیں، خیال ان لفظوں کی آپس میں کچھ گرہیں باندھتا اور کچھ کھولتا ہے، یوں یہ سارا سلسلہ بالآخر مکمل تحریر پر پڑاؤ ڈالتا ہے، لیکن رکتا پھر بھی نہیں، غیر محسوس طور پر جاری رہتا ہے اور خیالات کی ندرت آگے سے آگے سوچنے اور لکھنے پر مائل کرتی جاتی ہے۔ اسی ''چین ری ایکشن'' کی ایک اہم کڑی

"گُلِ مصلوب"، آج ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

صدیوں قبل وجود میں آنے والی اُردو زبان دنیا کی زرخیز ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ جو نہ صرف اظہار اور تاثرات کو پیش کرنے کے لیے وسیع تر لفظی ذخیرہ فراہم کرتی ہے بلکہ لچک دار ساخت کی وجہ سے دنیا کی دیگر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ شاندار ماضی کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے، حالیہ برسوں میں جدید اُردو افسانے نے ایک کروٹ لی ہے۔ جس کے نتیجے میں پرانے اور مروّجہ موضوعات کو نئے موضوعات، الفاظ اور بیانیے نے آہستہ آہستہ بدلنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم قدرتی عمل ہے، جس میں بدلتے وقت کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے جدت کی آمیزش ضروری ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زبان اور اُس کے ساتھ ساتھ شعروادب بھی صفحۂ ہستی سے فنا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ، اِس کروٹ کے دوران تبدیلی کا رخ احتیاط سے متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قاری کو تحریر میں اپنے اردگرد معاشرے کی علامات دکھائی نہ دیں تو اُس کی دلچسپی ماند پڑ جاتی ہے۔ اور مطالعہ ایک ایسا عمل ہے جس میں دلچسپی کا عنصر نہ ہو تو بے کار ہے۔ چنانچہ لکھاری کا اِس حوالے سے زمانے کا ہم قدم ہونا ضروری ہے۔ جس میں موضوعات سے لے کر اندازِ تحریر، زبان و بیان اور دیگر کئی اہم عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

سبین علی کا "گُلِ مصلوب"، افسانے کی نئی کروٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ سب سے پہلے تو اِس افسانوی مجموعے کا عنوان قارئین کا ہاتھ ہولے سے تھام کر اپنے پاس بٹھا لیتا ہے اور ہم اِس نام کی خوبصورتی کو کچھ وقت دیئے بغیر صفحات کی پرتوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دیکھا جائے تو ہر گُل اپنی شاخ پر مصلوب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ کھلتا ہے، خوشبو اور رنگ بکھیرتا ہے۔ اور آخر کار پتیوں کی شکل میں اپنی ذات دھرتی کے سپرد کر کے نہ ختم ہونے والے قدرتی عمل کا پھر سے حصہ بن جاتا ہے۔ علامتی لحاظ سے دیکھا جائے تو "گُلِ مصلوب" کی مثال انسان پر بھی صادق آتی ہے، کہ انسان کی

دنیاوی زندگی بھی اِنہیں مراحل سے گزر کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ''گُلِ مصلوب'' کا انسان کی طرح زمین سے گہرا ناطہ ہوتا ہے۔ شاخ، کانٹے، شبنم، پتے، ہوا، بارش، دھوپ، چھاؤں اور باغبان اُس کی زندگی کے اہم جزو ہیں۔ لہٰذا اِس نام کے انتخاب کے پیچھے یقیناً ایک گہرا فلسفۂ حیات پنہاں ہے۔ فلسفہ، سوچنے پر مائل کرتا ہے اور سوچ کے در، وا کرنے والا فکری جھونکا یقیناً تخلیقی حبس کے موسم میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتا ہے۔

اِسی طرح، جملوں میں لفظ آگے پیچھے سلیقے سے بندھے ہوں تو تحریر کی روانی متاثر کن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات ان حروف، الفاظ، جملوں اور تحاریر کے مجموعے میں ایک اہم چیز بھی موجود ہوتی ہے جسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے، وہ خاموشی ہے۔ خاموشی کے وقفے گو گفتگو میں تو بات کو معنی خیز بنا سکتے ہیں مگر تحریر میں اِس خاموشی کو اُتارنا اور پھر خاموشی کو بُلوانا ایک فن ہے۔ جس کا استعمال، سبین علی، مہارت سے اپنی تحاریر میں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ آوازیں موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ مختلف اجسام کی مخصوص آوازیں اُن کی پہچان ہوتی ہیں۔ سماعت کی حِس سے سرفراز جاندار، آوازوں کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ اگرچہ کسی کی زبان کے لفظ سمجھ میں نہ بھی آئیں مگر لب ولہجہ سے قیافہ شناسی کی حِس بھی جانداروں کو عطا ہوئی ہے۔ لیکن جب ہم تحریر کی بات کرتے ہیں تو اِس حوالے سے کچھ پابندیاں ایسی ہیں جو زبان سے الفاظ کی ادائیگی کے مقابلے میں تحریر کو محدود نوعیت کا بنا دیتی ہیں، جس میں تاثرات کا استعمال نہایت اہم ہے۔ چنانچہ تحریر میں الفاظ کا انتخاب، ان کی ترتیب اور ساتھ ساتھ تاثرات کے استعمال کا طریقہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ''گُلِ مصلوب'' کے مطالعے کے دوران احساس ہوتا ہے کہ تاثرات کو بڑی مہارت سے تحریر میں گوندھا گیا ہے۔ حروف اور تاثرات کے اِس بھرپور تال میل کی وجہ سے یہ کہانیاں، زندہ اور جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہیں۔

''گُلِ مصلوب'' کی باغباں، سبین علی ہیں۔ جنہوں نے فکری کشید کی چھلنی سے

روایت و جدت، جذبہ و تخیل، حُسن و محبت، تلخی و اُمید جیسے بے شمار گوہرِ نایاب تلاش کر کے اُن کا کامیاب مرکب تیار کیا ہے۔ اِس ضمن میں چند اہم باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ عام طور پر دو مختلف ممالک کے کلچر سے منسلک ہونے کے بعد تحریر میں ایک مخصوص توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ لکھاری کا مادر وطن اور زبان مختلف ہو اور وہ کسی اور ملک میں رہائش پذیر ہو، تو ایسی صورت میں تحریر کا ڈھب، لہجہ اور ساخت کو اپنی زبان کے مطابق قابلِ مطالعہ رکھنے کے لیے اعلیٰ قسم کے کرافٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سبین علی اِس ضمن میں تمام تر بنیادی پیمانوں کی کسوٹی پر پوری اُترتی دکھائی دیتی ہیں۔ خوش کن امر یہ ہے کہ پاکستان سے تعلق ہونے اور پھر سعودی عرب میں بسنے کے بعد بھی اِن کی تحریر میں مٹی کی مہک کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات، الفاظ، نام، مغربی معاشرے کی کہانی و کردار بھی شامل ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ سبین علی کہیں بھی مختلف تہذیبوں کے درمیان تذبذب کا شکار دکھائی نہیں دیتیں اور قدامت و جدّت کے اِس حسین امتزاج میں بھٹکنے کے بجائے، خوداعتمادی سے پیش قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ عالمگیریت کا یہ پہلو اُن کی تحریر کی اہم خوبی بن کر سامنے آیا ہے، جس سے بیان میں مزید پختگی آئی ہے اور تنوع کے باعث وہ فاصلہ (Gap) گھٹتا دکھائی دیتا ہے جو اُردو ادب اور دیگر معروف جدید زبانوں کے ادبی مزاج کے درمیان حائل ہے۔ یہ پہلو یقیناً نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اُردو زبان کے نئے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا باعث بھی ہے۔ اِن شاء اللہ

بہتے ہوئے وقت کا شور، اٹھلاتے جملوں کی چاپ، ڈھلتے ہوئے سورج کے الوداعی کلمات، صحرا میں ریت کی سرگوشی، سوچ کی جھڑی سے ٹپ ٹپ برستے الفاظ، ذہن کی وسعتوں میں تخلیق کے مدار پر گردش کرتے متنوع موضوعات۔ ایک منفرد جہاں، سبین علی صاحبہ کے ''گُلِ مصلوب'' کی بائیس پتیوں کی پرتیں پر تنے پرعیاں ہوتا ہے۔ اُردو افسانے کا مستقبل اب نئی نسل کے مستحکم اور توانا ارادوں، سوچوں کے سپرد ہو

رہا ہے۔ جس میں نئی، پرانی ہر قسم کی چاشنی موجود ہے۔ جیسے گزرتے ہوئے لمحے، آنے والے لمحوں سے بیتے وقتوں کا دھاگہ تھام کر ایک نئی کہانی بن رہے ہوں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس افسانوی مجموعے کی تیاری میں جلد بازی کا ہرگز مظاہرہ نہیں کیا گیا اور مناسب وقت اور توجہ کے بعد بالآخر ''گُلِ مصلوب'' شاخِ ادب پر عرصۂ طویل کے لیے لہلہانے کو تیار ہے۔ میں موقع کی مناسبت سے یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ مجھے فخر ہے، سبین علی صاحبہ اپنے ادبی کیریئر کی ابتدا میں جناب احمد ندیؔم قاسمی صاحب کے معتبر ادبی جریدے ''فنون'' کے ساتھ منسلک ہوئیں اور آج بھی اُن کا تخلیقی تعاون فراوانی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ میں ذاتی طور پر اور ''فنون'' کی جانب سے سبین علی صاحبہ کی ادبی میدان میں بھرپور کامیابی کا متمنی ہوں۔ دُعا ہے کہ:

یہاں جو پھول کِھلے، وہ کِھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
(احمد ندیؔم قاسمی)

کلمہ و مہمل

سرد اداس موسم میں رات جلد اتر آتی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کے لیے جا چکے ہیں اور میں رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی ہاتھ میں قلم تھامے اپنی یادوں کی ڈائری کھولے بیٹھی ہوں، میرے اردگرد کئی کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔لفظ کے معنی اور مفہوم کی کھوج نے مجھے لکھنے کی ایسی عادت ڈالی کہ میں حروف سے الفاظ جوڑتی رہتی ہوں۔

دنیا میرے لیے ایک رنگین پہیلی ہے جو فلک سے زمین تک کسی پینٹنگ کی صورت میں اپنا دامن پھیلائے آویزاں ہے۔ میں نے اپنے اردگرد بکھرے کبھی نہ ختم ہونے والے سکوت میں بستیاں، دریا، پہاڑ، وادیاں، پھول، چشمے اور خوبصورت پرندے دیکھ کر سوچتی ہوں کہ یہ سب رنگ جب کلام کرتے ہوں گے تو کیسی آوازیں آتی ہوں گی؟ جب جھرنا گرتا ہے، دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے اور تیز ہوا میں بسی پتوں کی خوشبو ہمیں چھو کر گزرتی ہے تو سرگوشیوں کا سماں بھی بندھتا ہوگا؟ جب لوگ کسی دھن پر سَر دُھنتے ہیں تو ان کے اندر آخر کون سی تحریک ارتعاش پیدا کرتی ہے۔

باہر سے نامراد ہو کر میں نے اپنے اندر جھانک کر اندرونی آوازوں کو سننے کی کوشش کی تو بارہا مجھے ایسا لگا گویا باریک ریشم کے کئی تار آپس میں الجھ گئے ہیں اور میں انھیں سلجھانے کے جتن کر رہی ہوں۔ کبھی کبھار یہ تار پھیل کر ایک چادر سی تان لیتے ہیں

تو کبھی الجھنیں ہی الجھنیں حواس پر چھا جاتی ہیں۔

جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف ماں کو پایا۔ بن کہے جاننے والی ماں کے لیے میرا وجود کئی آزمائشوں سے بڑھ کر تھا۔ لوگوں کی ہمدردی اور تاسف بھری نظریں وہ پہلی تحریر تھی جو میں نے چہروں پر لکھی دیکھی اور پڑھی۔ کئی بار افسردہ ہو کر ماں کو رات کے آخری پہر سجدے میں روتے گڑگڑاتے دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح اُن کے آنسو مجھ سے پوشیدہ رہیں گے مگر ایسا نہ تھا۔ میں ماں کو اس کی خوشبو سے پہچانتی تھی اور جس پل بھی وہ خوشبو مجھ سے دور ہوتی یا پریشان ہوتی تو مجھے علم ہو جاتا۔ ہاں مگر تب مجھے یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ آخر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو ماں چھپ چھپ کر روتی ہے۔ اگر کسی پل ماں کی توجہ دوسری جانب ہوتی تو میں آ آ آؤ کی صورت آوازیں دینا شروع کر دیتی۔

میری پیدائشی طور پر سماعت اور نتیجتاً گویائی سے محرومی نے میرے والدین کو جس دباؤ کا شکار کیا اس نے مجھے بہت حساس بنا دیا۔ میں نے بہت جلد لوگوں کے چہرے پڑھنا سیکھ لیے۔ لبوں کی جنبش سے لے کر آنکھوں کے کنارے تک ابھر آنے والی ہر لکیر میرے لیے پیغام رسانی کا کام کرتی۔ مسکراہٹ، غصہ، بیزاری، ہمدردی، نفرت یا محبت سب کی تحریر چہرے کے زاویوں اور آنکھوں میں الگ خطوط میں نمایاں ہوتی۔ تاثرات کے رسم الخط میں لکھی یہ تحریریں اکثر اوقات بہت تکلیف دہ ہوتیں۔ کیونکہ جب بھی میں جواباً کچھ کہنے کی یا بتانے کی کوشش کرتی تو میری آ آؤ نما آوازوں سے دوسروں کے چہروں پر پیدا ہوئی بیزاری مجھے مزید کوئی آواز بلند کرنے سے روک دیتی، اس لیے خاموشی سے اپنے ماحول اور دنیا کے ساتھ مطابقت کو سیکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔

کچھ ہی برسوں میں میں اپنے کئی چھوٹے موٹے کام خود سر انجام دینا سیکھ رہی تھی مگر میری سماجی نشو و نما بہت سست رہی۔ ہر وقت صرف ماں یا باپ کے آگے پیچھے پھرنا اور ہر کام ہر ادھوری بات پر صرف انھی پر انحصار کرنا میری مجبوری تھا۔ دوسرے لوگوں یا

ہم عمر بچوں کے ساتھ کمیونیکیشن گیپ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ کچھ برسوں بعد مجھ سے چھوٹے جڑواں بھائیوں کی آمد سے ماں کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں مگر گھڑی کی پھسلتی سوئیوں سے بھی زیادہ مصروف ماں کی پہلی ترجیح میری ذات ہی رہی۔ اسی دوران میری تعلیم و تربیت کے لیے مناسب اسکول کی تلاش شروع ہوئی تو مجھے معذور بچوں کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سپیشل ایجوکیشن اسکول میں جو پہلا مثبت احساس ملا وہ یہ تھا میں اس مشکل میں اکیلی نہیں ہوں بلکہ دنیا میں ایسی لاتعداد کہانیاں بکھری پڑی ہیں اور اب مجھے اپنی محرومی پر دل گرفتہ ہونے کی بجائے اپنے اندر اُلجھی ریشم کی ڈوریوں کو سلجھانا ہے۔ سائین لینگوئج سیکھنے کے ساتھ پڑھنا لکھنا شروع کیا تو مجھے اس بات کا ادراک ہوا کہ میں خود پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ خود پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے محسوسات کی ترسیل کے لیے میرا سب سے پہلا رشتہ پنسل، رنگ اور برش سے جڑا۔

مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں سے بے پناہ محبت شاید فطرت میں ودیعت ہوئی تھی۔ ماں کے ساتھ ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی میں پھولی نہ سماتی۔ جب وہ میرے بالوں میں بنی چھوٹی سی پونی ٹیل کھینچتے تو بجائے کوفت کے مجھے ان پر پیار آتا۔ میرا دل چاہتا کہ کہیں کسی پہاڑ کے دامن میں چشموں کے قریب ہم تینوں بہن بھائی سبز گھاس کے مخملی فرش پر اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں اس میں دھواں اگلنے والی چمنی ہو، چھت کے کھپروں پر برف جمی ہو یا کسی درخت کے اوپر پیارا سا ٹری ہاؤس ہو اور اس ٹری ہاؤس میں بیٹھ کر میں گھنٹوں پرندوں اور بادلوں سے خامشی کی زبان میں ہم کلام رہوں۔ سب نظاروں سے رنگ چرا کر اپنی پینٹنگ میں بھر دوں۔ جہاں آبشاریں چشمے اور بارش کا پانی ہر روز پھولوں کا چہرہ دھو ڈالیں اور گھاس کی ایک ایک پتی کی نوک تک سنوار دیں۔ شبنم کے قطرے ہیروں کی مانند پنکھڑیوں کا زیور بنے رہیں۔ سورج شام کے ان نظاروں کو خدا حافظ کہنے لگے تو مہندی کا رنگ افق کے ہاتھوں پر پھیلا دے۔ مہندی سے یاد آیا مجھے مہندی بہت پسند ہے اس کی خوشبو مجھ سے ہم کلام ہوتی ہے اور چیڑ کے

درختوں کی بھینی مہک مجھے کسی اور دنیا کی کہانی سناتی ہے۔ ہر مہک اپنی زبان میں مجھے الگ ہی پیغام دیتی ہے۔

جلد ہی مجھے اپنے دونوں جڑواں بھائیوں کی ہر ادھوری بات سمجھ آنے لگی اور وہ بھی باتیں کرنا سیکھنے کے علاوہ سائین لینگوئج بھی سمجھنے لگے۔ ماں ان دونوں کو آیا کے پاس چھوڑ کر اسی طرح میرے ساتھ سائین لینگوئج سیکھتی اور سپیچ تھراپی سنٹر میں گھن چکر بنی رہتی۔ سماعت سے مکمل محرومی سپیچ تھراپی میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ سائین لینگوئج سے حروف اور الفاظ کی پہچان کے بعد میں پڑھنا سیکھ گئی تھی مگر میرے والدین کی بڑی شدید خواہش تھی کہ میں کچھ ضروری اور اہم الفاظ ادا کرنا بھی سیکھ لوں۔ مگر کئی ماہ کی سپیچ تھراپی کے بعد بھی میرے ٹوٹے حروف الفاظ کا روپ نہ دھار سکے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کتنے ہی الفاظ میرے ذہن کی غلام گردشوں میں گلا گھٹ جانے سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کئی الفاظ کونوں کھدروں میں چھپے، مفہوم ادا کرنے کی سعی لاحاصل کرتے حیراں لب بستہ، ڈرے سہمے ادھ موئے رہ جاتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کیا یہ کبھی کلمہ بننے کا شرف حاصل کر پائیں گے یا مہمل ہی رہیں گے؟ بے معنی الفاظ کی محرومی کو تصاویر اور پینٹنگ میں ڈھالنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کم سنی میں ہی قلم اور برش میری زباں بن گئے۔ جہاں تخیل کی سبز مخملی گھاس پر میرے خواب پرندوں کی صورت محو پرواز رہتے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سبز مخملیں گھاس میں کنکھجورے رینگتے ہوئے داخل ہوئے اور میری تصوراتی دنیا کی خوبصورت تصویر میں پہلی سنگین بدصورتی سرسرانے لگی۔ یہ سکول بس کے کنڈیکٹر کا ہاتھ تھا جو سب سے نظریں بچا کر میری فراک کے اندر رینگتا رانوں تک چلا گیا۔ مجھے شدید الجھن ہونے لگی۔ میرا دل چاہا کہ میں چلا کر کسی سے کہوں یا اس کے ہاتھ پر کوئی کیڑے مار زہر انڈیل دوں اور یہ کنکھجورے جیسے ہاتھ پھر کبھی میرے جسم پر رینگنے کی کوشش نہ کریں۔ میں کچھ نہ کر پائی اور کسی کو بتا تو سکتی نہیں تھی مگر اس

واقعے کے اثرات اس طرح نمایاں ہوئے کہ میں نے اجنبی لوگوں سے جھجکنا اور کترانا شروع کر دیا۔ سکول بس میں کھڑکی کی طرف سمٹ کر بیٹھتی اور کسی بھی محفل میں سب سے الگ گم سم بیٹھی رہتی۔ میرا ہاتھوں کی مدد سے شور شرابا اور چیخنا چلانا اپنی ہم جماعت لڑکیوں اور گھر والوں تک محدود ہو گیا تھا۔ میں نے سیکھ لیا کہ مجھے اپنی کمزوریوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہے۔ اور لوگوں سے اپنی اس محرومی کو چھپانا بھی ہے۔ اس طرح میں نے آ آ آ اووو جیسے واولز میں چلانا چھوڑ دیا اور سنجیدگی سے ساری توجہ اپنی پڑھائی کی جانب مرکوز کر دی۔

میں نے ہزاروں الفاظ پڑھنا سیکھے۔ ان کا مفہوم سمجھا۔ بہت جلد میں یہ جان گئی تھی کہ اپنی زندگی کو کسی مثبت رخ سے سنوارنے کے لیے یہ حروف جو بامعنی الفاظ کو جنم دیتے ہیں، کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ٹین ایج میں پہنچ کر مہمل الفاظ کا کرب اور زیادہ بڑھ گیا۔ بڑی ہونے کے ساتھ جہاں مجھ سے وابستہ توقعات اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا وہیں کئی جسمانی تبدیلیاں بھی چپکے چپکے آتی گئیں۔ لوگوں کے چہرے پر نئی طرز کی تحریر ابھرنے لگی۔ کئی آنکھیں ایکسرے مشین کی مانند میرے نمو پاتے جسم کا اسکین کرنے لگیں۔ وہی لوگ وہی راستے مگر راہگزر میں بیٹھا ہر شخص مجھے مشکوک نظروں سے گھورتا نظر آتا۔ میرے اڑوس پڑوس میں کئی انکل جو کبھی مجھے ایک گڑیا سمجھا کرتے تھے ان کی نظریں چوری چھپے میرے خدوخال کا جائزہ لیتیں تو میرا دل چاہتا کہ کوئی تو محرم راز ہو جسے یہ سب بتا سکوں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ اپنے ہم عمر دوستوں سے تو بانٹ سکتے ہیں مگر اپنے والدین سے نہیں۔ اس عمر میں ایسا لگتا ہے کہ ماں یا باپ ہماری بات نہیں سمجھیں گے یا انھیں ہماری مشکلات کا صحیح ادراک نہیں ہو پائے گا اس لیے انھیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہمارے گھر میں مہمانوں کو خدا کی رحمت سمجھا جاتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ گھر میں کوئی عزیز رشتہ دار، امی کی سہیلیاں یا ابو کے دوست نہ آتے۔ باورچی خانے میں گہما

گھی جاری رہتی۔ بڑھوتری کی اس عمر میں مجھے مہمانوں سے جھجک ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ میرے جسم کے زاویوں میں تبدیلی نہیں تھی جیسا کہ سب لوگ یہی لکھتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ لوگوں کے چہروں پر ابھرتی تحریر میں تبدیلی تھی۔ یہ تبدیلی مجھے سینکڑوں پاؤں کے ساتھ رینگتے کیڑے کی مانند لگتی جیسے ایک دن کنڈیکٹر کا ہاتھ کنکھجورا بن گیا تھا۔ اسی دوران میری دوبارہ سے شروع ہونے والی سپیچ تھراپی کو جاری ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ ساتھ ساتھ سیکنڈری سکول کے امتحانات کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ ماں نے مجھے خود انحصاری سکھانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ مجھے کسی منزل تک پہنچانے کا جنون ان کی زندگی کا سب سے بڑا جذبہ تھا۔ دوسری بار سپیچ تھراپی سے گزرتے وقت میں نے اپنے اندر کی سب توانائیوں کو سمیٹ کر ایک نقطے پر مرکوز کر لیا تھا۔ سپیچ تھراپسٹ کے مطابق میرے حروف آ آ آ و سے آں اور ما تک ڈھل چکے تھے۔ تب ماں کی آنکھوں میں آس چمکتی تھی کہ میں جلد ہی حروف سے الفاظ ترتیب دے کر انھیں ادا کر سکوں گی۔

ایک دن جب ماں سو رہی تھیں گھر میں والد کے ایک مہمان آئے جنھیں ملازمہ ڈرائینگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ میں جو رات دیر گئے تک بھائیوں کی شرارتوں اور کھینچا تانی سے بچنے کے لیے ڈرائینگ روم میں اپنی واٹر کلر کی پینٹنگ مکمل کرتی رہی تھی، مہمان کی موجودگی سے لاعلم اس پینٹنگ کو لینے کے لیے وہاں چلی گئی۔ اچانک مجھے سامنے پا کر وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بتایا کہ والد گھر پر موجود نہیں ہیں۔ اس شخص نے بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھا اور سے اشاروں میں بات کی، میری کچھ حسیات بہت تیز ہیں اور انھیں میں سے کوئی حس سائرن بجانے لگی تھی۔ مگر مجھے فوراً سمجھ نہیں آئی کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک اس شخص نے شفقت کا چولا اتارا اور سر پر پھرنے والا ہاتھ میرے بدن پر رینگنے لگا۔ اور پھر وہ کنکھجورا ایک عفریت کی شکل میں ڈھلنے لگا۔ میرے سارے بدن میں خوف کی سرد لہر سرایت کرتی چلی گئی میں کیا کروں؟ کیسے خود کو اس شخص کی گرفت سے آزاد کراؤں؟

یہ ملازمہ اسے اندر کیوں بلا لائی۔ اور اب وہ خود کہاں چلی گئی؟ ماں سو رہی ہے اسے کیسے علم ہوگا کہ اپنے ہی گھر میں اس کی بیٹی کو کوئی ہراساں کر رہا ہے۔ پھر نجانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ خود کو اس عفریت کی گرفت سے آزاد کراتے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور چلا کر اونچی آواز میں کہا.............

آں مآ مآ .... ماما ....ماما............. اور وہ عفریت دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ مہمل شخص تو اپنے خبیث ارادے میں ناکام ہو کر باہر نکل گیا مگر اس دوران اپنا دفاع کرتے وقت میں نے اپنے اندر کی تمام تر توانائی کو سمیٹ کر مہمل سے ایک بامعنی کلمے کا سفر کیا تھا جس میں کئی ماہ کی سپیچ تھراپی کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ تب مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ سماعت کو بصارت پر فوقیت کیوں حاصل ہے۔ نابینا کتنی آسانی سے بول سکتے ہیں اور سیکھ سمجھ لیتے ہیں۔ مگر میرے لیے حروف جو کتابوں پر الفاظ کی صورت جگمگاتے ہیں ایک پہیلی کیوں بنے رہتے ہیں۔ کاغذ پر لکھے اس لفظ کا یہ مطلب ہے؟ اتنی سی بات سیکھنے میں مجھے کتنی مشقت اٹھانا پڑتی رہی اور سننے والے کیسے آرام سے وہ سب الفاظ اپنی زبان سے ادا کر دیتے ہیں۔ جہاں میں ایک چھوٹا سا لفظ، جو دن رات میری ہر طرح کی ضروریات پوری کرتی، مشکلیں سہتی، حوصلہ بڑھاتی ماں کے وجود کا اظہار کر رہا تھا ''ماما............ ماما............'' کس کرب سے گزر کر ادا کر پائی گویا اس لفظ کو میں نے اپنے شعور کی کوکھ سے خود جنم دیا ہو۔ اور ماں یہ لفظ سن کر خوشی سے سرشاری سے کتنا روئی تھی کہ میں فوری طور پر خود پر گزری بات بھی نہ بتا پائی۔

اس حادثے کے بعد بجائے خوف زدہ ہونے کے میں نے ہمت اور جرأت سے حالات اور لوگوں کا سامنا کرنا سیکھا۔ زبان ہوتے ہوئے بھی زبان بریدہ ہونے کا احساس تو باقی رہا لیکن اسے اپنی رکاوٹ نہ بننے دیا۔ مسلسل کوشش اور محنت سے تعلیمی مدارج طے کرتی چلی گئی۔ اپنی ہر محرومی اور اندرونی دباؤ کے مرتبان پر ایک ڈھکن رکھ

دیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انفارمیشن ٹیکنالوجی سے منسلک ایک ادارے میں مجھے جاب مل گئی۔ یوں اپنی ذات کے ادراک کے سفر میں کئی اچھے بُرے دنوں سے گزرتی اعلیٰ تعلیم کے دوران اور پھر نوکری پر اپنے بیرونی اور اندورنی دباؤ کے خلاف ڈٹی رہی ہوں۔

محبت، شادی، اپنا گھر بار یہ سب ابھی تک میرے لیے پہیلیاں ہی ہیں۔ شاید کسی دن یہ پہیلیاں بھی سلجھ جائیں یا شاید ہمیشہ اُلجھی رہیں۔ تنہائیاں کبھی کبھی عذاب بن جاتی ہیں۔ طاقت گفتار نہ ہوتو اپنا معمولی درد بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ماں بِن کہے ہی سب سمجھ جاتی تھی مگر اسے جانے کی جلدی تھی وہ مجھے بہت جلد چھوڑ گئی۔ پھر یہ عالم ہوا کہ نوکری کے ساتھ اپنے کام کاج کرتے کبھی تھکن کا گلہ بھی نہ کرسکی۔ کسی کو یہ نہیں بتا سکی کہ سر میں درد بھی ہے۔ میری خواہش کیا ہے یا میں سوچ کیا رہی ہوں میرے بھی کچھ خواب ہیں۔ تنہائی سی تنہائی ہے۔ بھائی اور اسی سال گھر میں آنے والی بھابھیاں اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے جا چکے ہیں۔ اور منجمد کر دینے والے سرد موسم میں گیس ہیٹر جلائے میں اپنی یادوں کی پٹاری کھولے حروف سے الفاظ بن کر انھیں رقم کر رہی ہوں۔ یہ الفاظ ہی میری آواز ہیں۔ یہ اب مہمل نہیں رہے، کلمہ بن کر خاموشی کی زبان میں دیر تک مجھ سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہی اب میرے سچے ساتھی ہیں۔

◆

کتن والی

سوت کو مختلف رنگوں میں رنگ کر امتزاج اور توازن کو صغریٰ مائی جانے کس طرح قائم رکھتی تھی اور یہ بھی کسی کے علم میں نہیں تھا کہ کچی آبادی میں بسنے کی بجائے جولاہوں کے اس مختصر کنبے نے جھگی بڑی نہر اور راجباہ کے بیچ میں موجود جگہ پر کیوں ڈال رکھی تھی۔ پہلے پہل یہ علاقہ مضافات میں شمار کیا جاتا تھا مگر کچھ سال بعد ہی شہر کے اندر شامل ہو چکا تھا۔

فیکے جولاہے کی انگلیاں پاور لوموں کے بیم سے اترے ویسٹ تانے کو بل دے کر سوت بٹنے کی اتنی عادی ہو چکی تھیں کہ خواہ وہ حقے کی تازہ چلم کو کش لگا رہا ہوتا یا کسی گاہک کو اپنی چرب زبانی سے گھیر کر کھیسوں کی افادیت پر دلائل دے رہا ہوتا، اس کی ٹیڑھی انگلیاں مسلسل گولے کو گھماتی اور بل دیتی رہتیں۔ ایک ہی لڑکا تھا جو ویونگ فیکٹری میں وائینڈر پر بابنیں بھرتا تھا۔ اگر کھیس چتنئی کا کوئی گاہک مل جاتا تو ان کی آبائی کھڈی چلتی ورنہ فیکا جولاہا سوت بٹ کر چارپائیاں بننے والا بان بنا ڈالتا۔

بابا فیکا اور صغریٰ جسے عرف عام میں سب مائی جولاہی کہتے تھے، فیصل آباد شہر میں بس کر خود کو قدرے آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ پاور لومز کی کثرت میں انھیں نہ صرف سوت آسانی سے دستیاب ہوتا بلکہ دستی کھڈی پر بنی دریاں کھیس اور چتنیاں بھی آسانی سے بک جاتیں۔ صغری جولاہی اور بابے فیکے پر بڑھاپے کی آمد آمد تھی۔ ان کی

انگلیوں پر سوتر کے گولوں کو بل دیتے اور تانے بانے میں الجھتے الجھتے گھٹے پڑ چکے تھے۔

مائی دبلی پتلی اور چست تھی۔ ہر کام بڑی محنت اور نفاست سے کرتی، تیکھے نقوش مگر رنگ دھوپ میں جل کر سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ بڑی روشن آنکھیں جن کی نظر عمر کے ساتھ کمزور ہو رہی تھی۔ بال کہیں سفید، کہیں سیاہ اور کہیں کہیں لال مہندی کے آثار کا پتا بتاتے۔ اکثر چھوٹے پھولوں والے پرنٹ کا گول گلے والا کرتا جس کی اطراف میں جیبیں لگی ہوتیں اور سادہ شلوار پہنتی۔ ایک ہاتھ میں کانچ کا موٹا کڑا، انگلیوں میں مختلف رنگوں کے کانچ کے چھلے اور کانوں میں چاندی کی بالیاں پہنے رکھتی۔ اس کی انگلیوں میں پرکھوں کا ہنر تھا تو فطرت میں رنگوں کے استعمال اور نمونے بنانے کی صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ عام سی جھگی کو اس نے نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ لال اینٹوں کے فرش پر جیومیٹری کی اشکال والے نمونوں سے مزین صاف ستھری دری پڑی ہوتی۔ جھگی کے دروازے پر پڑا پھولدار پردہ، مٹی کا چولہا جس پر نقش نگار بنے تھے، چھوٹی دیواریں اور گاچنی سے لیپ کیے ہوئے پیندے والے چمکتے برتن غرضیکہ جھگی کی ہر چیز اس کی نفاست کی گواہی دیتی۔

اُس سال سردی کی شدید لہر اور نہر کنارے پڑنے والی گہری دھند فیکے کو نمونیے کا تحفہ دے چکی تھی۔ کھانس کھانس کر بدحال ہو جاتا تو بلغم کے ساتھ کبھی چونی، کبھی اٹھنی جتنا خون بھی لگا ہوتا۔ دھیرے دھیرے اس کا وجود متروک سکوں کی مانند ختم ہوتا جا رہا تھا۔ کھڈی پر باریک تانا چڑھانے کا کام ان کے لڑکے بھولے کو نہیں آتا تھا۔ اگر بابا فیکا کسی طرح تانا باندھ دیتا تو بھولا کھڈی پر سادہ بنائی کر لیتا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی اور ہانڈی چولھا کرتے وقت مائی بہت شوق سے ریڈیو سنتی۔ کئی خبریں اور باتیں اس کے لیے بالکل انوکھی اور حیرانی کا باعث ہوتیں۔ کبھی ماہیے سنتی تو دھیان اپنے چہرے پر نمودار ہوتی جھریوں کی طرف بھی چلا جاتا۔

سوتر منڈی اور ملوں سے لے کر فیکے جولاہے تک ایک وقت میں سب لوگوں کا

روزگار خوب پھلا پھولا تھا۔ ہفتے میں ایک دن بجلی کا ناغہ ہوتا۔ کسی علاقے میں یہ ناغہ جمعے کو ہوتا اور کسی علاقے میں اتوار کو اور اسی دن مزدوروں کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی۔ ہر مزدور کم سہی لیکن رات کو دیہاڑی لے کر گھر آتا۔ مگر یہ سب اسی رفتار سے نمو پذیر نہ رہا۔ ریڈیو سا ندل بار پنجابی پروگرام میں میزبان اکثر کہا کرتا تھا! محنت کش اس قوم کا ہاتھ ہیں۔ کئی بار یہ سن کر اس کی سوچوں کا تانتا بندھ جاتا کہ مجھ جولاہی کے ان ہاتھوں نے کتنے سوت بٹے ہیں، پر جھگی سے باہر درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور بہتی نہر پر ان کا کیا حق؟ پھر سوچتی کہ ملک کی بڑی بڑی باتوں اور آنے والے وقت پر اس کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا گھاس کا موسموں پر۔ سورج اپنا سفر مختصر یا طویل کرتے وقت گھاس سے صلاح مشورہ کبھی نہیں کرتا۔ گھاس ہی خود کو موسموں کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

غیر محسوس طریقے سے پاؤڈر کا زہر پورے شہر یا شاید پورے ملک کی رگوں میں اتارا جا رہا تھا۔ مائی جولاہی کو تو ملک کے طول و عرض کا اندازہ تھا، نہ ہی شہروں کے نام یاد تھے۔ اس غریب نے تو پاس ہی صدیوں سے بسنے والا شہر لاہور تک نہ دیکھا تھا۔ سنا کرتی تھی ''جنے لہور نئیں ویکھیا اوہ جمیا ای نئیں'' تو کئی بار دل ہی دل میں ارادہ کرتی کہ اگر اس بار اچھی بچت ہوئی تو داتا دربار کا عرس دیکھنے کے بہانے ہی لہور شہر دیکھ لے گی۔

مگر اسے اتنا ضرور علم تھا کہ لڑکوں بالوں اور دیہاڑی پر کام کرنے والے غریب مزدوروں کی کثیر تعداد آہستہ آہستہ ہیروئین کی پڑیوں کے نشے کی عادی ہو چکی جن میں بھولا بھی شامل تھا۔ ان کے وجود کے نئے نکور سکے دیا سلائی کی آنچ پر دہکتے سفید سے سیاہ ہوتے پاؤڈر کو اپنے اندر تحلیل کرتے کھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ اگر یہ سب اسے نظر آ رہا ہے تو بڑوں کو بھی نظر آتا ہوگا ایک دن وہ کوئی جادو کی چھڑی گھمائیں گے تو جیسے یہ پڑیاں گلی گلی بکنے لگی تھیں ایک دن اچانک غائب بھی ہو جائیں گی اور اس کا بھولا جواب وائینڈر پر بابنیں بھرنے کا کام قد نکلنے کی وجہ سے چھوڑ چکا ہے

پھر سے اپنے باپ کی کھڈی سنبھال لے گا۔

انھی دنوں فیکا جولاہا گرمیوں کا موسم آنے سے قبل ہی مٹی میں جا سمایا۔ بھولا کبھی لوموں پر کام کر لیتا تو کبھی سوت بٹ لیتا۔ کہیں اسی تو کہیں سو روپیہ دیہاڑی ملتی تھی جس میں سے پچاس روپے کی پُڑی آ جاتی۔ اگر پُڑی نہ پیتا تو سارا بدن ٹوٹنے لگتا اور وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپتا مٹی میں پلسیٹیاں لیتا ہائے ہائے کرتا رہتا۔ مائی جولاہی سے اکلوتی اولاد کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی۔ اسی مجبوری میں اجرت پر کبھی کسی کی چارپائیوں کے سنگے نکال آتی تو کہیں کسی کے گھر میں رضائیوں کے نگندنے بھر آتی کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رہے۔

کچھ عرصہ تو اسی طرح چلتا رہا مگر جب بھولا بالکل ہی کام سے جانے لگا تو مائی جولاہی نے ہمت پکڑی کہ کسی طرح کھڈی پھر سے چلنے لگے۔

بی بی جی ہم ہنر مند ہیں، بھیک مانگ کرنہیں کھاتے، رب سوہنے کا کرم کہ کھڈی کی صورت روزی کی آس لگائی ہوئی ہے۔ بس اتنی حسرت ہے کہ کہیں سے سوتر مل جائے تو مہینوں کا بیکار پڑا بھولا کھڈی جوڑ لے۔

مائی جولاہی عاصمہ سے منت سماجت کر رہی تھی۔

عاصمہ ایک کالج میں تاریخ کی لیکچرار تھی۔ اکثر گھر کے کام کاج کے لیے اسے کسی کام کرنے والی عورت کی ضرورت پیش آتی رہتی۔ مائی جولاہی کئی بار ان کی رضائیاں نگند چکی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ عاصمہ بی بی کے میاں کی ویونگ فیکٹری ہے تو مائی نے بڑی آس لگاتے ہوئے اسے اپنا دکھڑا کہہ سنایا۔ عاصمہ ایک خداترس عورت تھی اسے مائی جولاہی کے سب حالات کا علم ہوا تو دل میں اس غریب عورت کے لیے ہمدردی جاگ اٹھی۔

مائی کھیسوں کا تو رواج ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا خیر میں تمھیں فیکٹری سے ویسٹ منگوا دوں گی تم دیکھ لینا اس سے کیا بنتا ہے، عاصمہ نے مائی جولاہی کو دلاسا دیا۔

کچھ دن بعد جب عاصمہ کے گھر سے مائی جولاہی سوت لے کر نکلی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ ادھورے اور کچھ اَن دیکھے خواب پھر سے بُننے لگیں۔ جھگی کی طرف اٹھتے ہر قدم کے ساتھ ازلی تفکرات کے تانے میں خوابوں کا بانا جوڑتی رہی کہ اس بار بھولے کا علاج کرا لے گی۔ کچی آبادی میں کوئی ڈھائی مرلے کا مکان بھی لے گی، بھولے کے سر سہرہ سجے گا تو سونا آنگن کھل اٹھے گا۔

بھولا جو اپنے نشے کی لت سے تنگ آ چکا تھا مگر جان چھڑانے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں تھا، سوت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اگر موٹے بانے کے ساتھ ایک دن میں ایک دری بنا لیتا تو سو روپے کی بچت لازمی تھی۔

مائی جولاہی نے اپنی ماہر انگلیوں سے تانا باندھنا شروع کیا تو بھولا بھی ساتھ لگ گیا۔ بانے کے لیے مائی نے سوت کو لال نیلے پیلے جامنی اور کالے رنگوں میں رنگ کر ڈیزائین بھولے کو سمجھانا شروع کیے۔ بھولا جو پاور لوموں پر کام کرنے کی وجہ سے دستی کھڈی پر ڈیزائین والے کھیس دریاں بنانا اچھی طرح سے سیکھ نہیں پایا تھا، ایک مفعول بنا ماں کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ جب دیگر کی بانگ کے ساتھ دری کھڈی سے اتاری تو طمانیت کا احساس اس کی ساری تھکن اتار گیا ان تخلیقی رنگوں میں امید کی کرن تھی۔ مائی نے اگلے ہی دن دری بغل میں دابی اور عاصمہ بی بی کے گھر پہنچ گئی۔ کھڈی چالو ہونے پر اس کی خوشی دیدنی تھی اس کا پہلا خواب تعبیر ہونے جا رہا تھا۔

عاصمہ جسے آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ بھی تھی بوڑھی ان پڑھ جولاہی کی فنکارانہ چابک دستی اور نفاست سے رنگوں کا استعمال دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مائی کی چوٹ نشانے پر پڑی تھی، اس نے جان لیا تھا کہ اپنے ہنر کو بدلتے وقت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ہی ان کی بقا ہے۔ اپنی اجرت لیتے ہوئے مائی نے بڑی امید کے ساتھ عاصمہ سے ایک اور تقاضا کیا۔

بی بی جی اگر ٹُسی برا نا مانو تے اپنے کالج کی دوسری استانیوں کو بھی میری بنی

دریاں دکھانا۔ تہاڈی مہربانی نال مجھ غریبنی کا آٹا دال لگا رہے گا۔
اچھا مائی تم ایسا کرو کچھ دریاں بنا کر تیار رکھو دو ہفتے بعد میری کچھ سہیلیاں آ رہی اس دن سب کو دریاں دکھانا شاید بِک جائیں۔ عاصمہ نے ہمدردی میں ہامی بھرتے ہوئے کہا۔
پر بی بی جی روز پچاس روپے تو بھولے کی پُڑی کے چاہئیں، پُڑی نہ ملے تو وہ کھڈی پر بھی نہ کھلو سکے۔ مائی نے فکر مندی سے کہا۔
مائی جتنا مجھ سے ہو سکا میں تیرا ساتھ دے تو رہی ہوں تیرے بیٹے کا کہیں سے علاج ہو جاتا تو اچھا تھا۔ عاصمہ نے تاسف سے کہا۔
بی بی جی اللہ وارث ہے۔ صغریٰ نے بڑے حوصلے سے امید بھرے لہجے میں جواب دیا۔
بھولے نے بھی جی جان سے ماں کا ساتھ دیا۔ ان کی بنی دریاں کچھ منفرد نمونوں کی بنا پر اور کچھ عاصمہ کی مدد کی وجہ سے خوب بکیں۔ اس کی کئی کولیگز نے مائی جولاہی سے اپنی اپنی پسند کے مطابق سائی دے کر مختلف طرز کے کھیس اور دریاں بنوائیں۔ عاصمہ کے دل میں مائی جولاہی کے فن اور مشقت کی وجہ سے جو انسیت اور ہمدردی پیدا ہو چکی تھی وہ صغریٰ کے لیے کسی بڑے آسرے سے کم نہ تھی۔
جیسے بجھنے سے قبل ایک بار چراغ پوری تمکنت سے جگمگاتا ہے اسی طرح کچھ عرصہ ان کا ہنر بھی جگمگایا۔ بھولے نے خراب صحت کے باوجود اپنی ماں کا ساتھ نبھاتے ہوئے منفرد سے منفرد نمونے بنائے گویا اپنی محنت کا سارا نچوڑ اور مائی کے فن کی ساری مہارت کھڈی میں ڈال کر کوئی عجوبے تخلیق کرنے بیٹھا ہو۔ مائی کے خوابوں کو ایک نیا جزیرہ مل گیا تھا کبھی خواب دیکھتی کہ اس کی بنی دریوں کی مانگ سارے شہر میں ہے۔ کبھی خواب میں ڈھیر سارا سوت نظر آتا تو کبھی بے شمار رنگ اور کبھی ایک کی بجائے دو دو کھڈیاں نظر آتیں۔ لیکن خوابوں کے برعکس بھولے کی دن بدن کمزور ہوتی صحت بدصورت حقیقت بن کر سامنے موجود ہوتی۔

جب سے عاصمہ کو شوگر کا مرض لاحق ہوا، اُسے ڈاکٹر نے صبح سویرے واک کرنے کی تاکید کی تھی۔ اکثر وہ نہر کنارے بنے ٹریک پر چہل قدمی کرنے جاتی جہاں بہت سے لوگ موجود ہوتے۔ بڑی سڑک کے ساتھ والی نہر سے کچھ آگے جا کر راجباہ نکلتی۔ وہاں قریب ہی مائی جولاہی کی جھونپڑی تھی۔ ایک بار وہ مائی کی جھونپڑی میں گئی تو اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر جکڑ لیا۔ بوڑھی عورت کا اکلوتا سہارا اس کا بیٹا بھولا سوکھ کر ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، سوکھے چمڑے جیسی جلد، جلے ہاتھ، زرد چہرہ، عاصمہ کو لگا جیسے وہ میوزیم میں رکھا کسی فاقہ زدہ شخص کا قدیم سنگی مجسمہ دیکھ رہی ہو۔

بھولے سے باریک کھیس پہلے ہی نہیں بنتے تھے اب موٹے سوت سے رنگین دریاں بنانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ صغریٰ اپنے ناتواں کندھوں پر جوان بیٹے کا بوجھ بڑی استقامت سے اٹھائے ہوئے تھی۔ بھولے کا کہیں آنا جانا اور جھونپڑی سے نکلنا بہت محدود ہو چکا تھا۔ صغریٰ خود ہی بُنت کرتی اور کسی نہ کسی طرح پیسے بچا کر اس کے لیے پُڑی لے آتی وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو نشہ ٹوٹنے پر بُری طرح تڑپتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ محنت و مشقت کی آدھی سے زائد کمائی اس طرح لٹ جاتی۔ پھر بھی وہ اپنی ہمت کسی مشکل وقت کے لیے بچائی نقدی کی مانند جوڑے رکھتی۔ لوگوں کے سامنے وہ نہ تو بھولے کی کمزور صحت کا رونا روتی اور نہ ہی نشہ کرنے پر اس کی برائی کرتی۔ سیاہ رات اپنے آنچل میں چمکتے ہوں یا گرہن لگے، چاند سمیٹ ہی لیتی ہے۔

گھر گھر جا کر دریاں منتیں کر کے بیچتی اور سوچتی کہ ساری بیبیاں ایک طرح کی کیوں نہیں ہوتیں؟ گلی کوچوں کی خاک چھانتی مائی طرح طرح کی باتیں سنتی۔ مائی جولاہی، جھلی، کملی، سوکھا دان، نمانی کئی ناموں سے مخاطب کی جاتی۔ مگر مائی جولاہی تو جیسے بہری ہو چکی تھی۔ اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ دریاں بیچنا اور پڑیاں خریدنا ہیں۔

وہ اکثر یہ خواب دیکھتی اور کبھی خواب دکھایا جاتا کہ گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ

آئے گا جو پلک جھپکنے میں اس کے بھولے کو بھلا چنگا کر دے گا پھر اپنی جادوئی چھڑی گھمائے گا اور ساری پڑیاں یک دم غائب ہو جائیں گی۔ اس کے کمزور ہاتھوں کی بنی مزین دریاں ہر ڈرائینگ روم کی زینت بنیں گی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس سپنے کی تعبیر ناممکنات جیسی بن چکی ہے پھر بھی سارا دن وہ اپنے خواب کو خود ہی سچ کرنے کے عمل میں جتی رہتی۔ اس کی خودداری اور اپنی انگلیوں پر مان برقرار تھا ورنہ پیٹ کا تنور بھرنے کو ہتھیلی پھیلانا کونسا مشکل تھا۔

عاصمہ ریفریشر کورس پر لاہور گئی ہوئی تھی۔ کئی دنوں بعد لوٹی تو پھر اپنی نوکری اور گھربار کی مصروفیت میں گم رہی چند ایک بار دل میں خیال آیا کہ مائی کا پتا کرے لیکن خیال خیال ہی رہا۔ کئی مہینوں بعد مائی اس کے گھر آئی۔ تھکی ماندی مضمحل اور کمزور، ایسا لگ رہا تھا کہ روئی کی پُونی کی بجائے کسی نے مائی کا وجود تکلے کی سوئی میں پرو ڈالا ہے۔ سمندر جیسی ڈونگھی آنکھوں کے گرد کالی ریت کی لکیریں زمانوں کے تھکا دینے والے سفر کا احوال بیان کر رہی تھیں۔ جھریوں کی چادر اوڑھے کالی جلد کی سلوٹیں جسم کا لباس بنی تھیں۔

عاصمہ اس کی یہ حالت دیکھ کر افسردگی سی پوچھنے لگی! مائی یہ کیا حالت بنا لی؟ اور اب تیرے بھولے کا کیا حال ہے؟

بس بی بی جی کیا بتاؤں اب تو اس کا ہاتھ پانی بھی میں خود کرتی ہوں نامراد پڑی پینے جوگا بھی نہیں رہ گیا۔ منجی سے جا لگا ہے۔ صغریٰ نے ایک آہ بھری سمندر میں گرداب اٹھا اور پاتال میں اتر گیا۔

یہ لو کچھ پیسے رکھ لو عاصمہ نے چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

نہ بی بی جی پیسے رین دیں۔ پڑی تو مل رہی پر لے کر کیا کرنی۔ آٹا کسی چکی ہٹی میں نہیں مل رہا۔ آپ تو سارے سال جوگی کنک اکٹھی لے کر رکھتی ہیں جی، بس اپنی ڈرمی سے تھوڑا آٹا ڈال دیو۔

یہ کہتے ہوئے مائی کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور حسرت بھری نظریں انگلیوں کے گٹھوں پر جمی تھیں۔

عاصمہ نے آٹا ڈال کر ساتھ کر دیا اور چلتے چلتے زبردستی چند روپے بھی مٹھی میں تھما دیے۔

انھی دنوں عاصمہ کو کسی دوسرے شہر ٹرانسفر ہو کر جانا پڑا۔ واپس فیصل آباد تبادلے کے لیے تین چار مہینے کتنے ہی پاپڑ بیلے اور دفتروں کی خاک چھانی تب جا کر دوسرے گرلز کالج میں پوسٹنگ ہوئی۔ اسی جھنجھٹ میں کئی مہینوں تک مائی کی کوئی خبر نہ لے سکی۔ ایک دن گوالے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ مائی جولاہی کا بھولا چل بسا تھا۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ خود جا کر مائی جولاہی سے تعزیت کرے گی۔

اگلے ہی روز شام کے وقت اس کے بچوں نے باہر کھانے اور گھومنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے میاں انھیں ایک بالکل نئے تعمیر ہوئے کینال پارک ریسٹورنٹ میں لے آئے۔ کھانے کے بعد بچے ادھر ادھر کھیلنے لگے۔ عاصمہ کے دل کو ہُڑک لگی ہوئی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ریسٹورنٹ جھگی کے قریب ہی بنا تھا۔ اسی تلاش میں وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی کافی آگے نکل گئی۔ پرانی راجباہ کے ساتھ جولاہوں کی جھگی کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا تھا۔ کھڈی کے لیے کھودی جگہ برابر تھی جس پر تازہ گھاس اگا دی گئی تھی مختلف کیاروں میں موسمی پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نہر کنارے ساری گرین بیلٹ دیکھنے والوں کو بہت خوب صورت نظارہ دے رہی تھی۔ جہاں کبھی جھگی ہوا کرتی تھی اس جگہ کسی ریسٹورنٹ کے مونوگرام والا سیمنٹ کا بنچ نصب تھا۔ عاصمہ نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی عینک اتار کر شیشے فلالین کے نرم رومال سے صاف کیے پھر دوبارہ عینک لگا کر گہری نظر سے ادھر ادھر دیکھا اور لڑکھڑا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

وے سائیں تیرے چرخے نے
اج کت لیا کتن والی نوں

ان ٹیوشن (Intuition)

درد کی لہریں نیلی ہوتی ہیں، سرخ یا پیلی۔ کیا ڈاکٹر پیشنٹ کمیونیکشن میں درد کی شدت کا رنگوں کے ذریعے اظہار کرنا ڈاکٹرز کی مدد کرسکتا ہے۔

دو ڈاکٹر آپس میں بحث کرتے ہوئے کوریڈور سے گزر رہے تھے۔

ان کی بات سن کر میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور اپنا رُکا ہوا قلم پھر سے اٹھالیا۔ کاغذ پر حروف خود بخود پھسلنے لگے۔

درد کی لہریں نیلی ہوتی ہیں یا سرخ؟ لیکن ہمیشہ نہیں، درد کی کئی لہریں ایچ یا بی پینسل، چارکول اور قلم سے بھی جنم لے لیتی ہیں جن میں نہ سرخ رنگ ہوتا ہے، نہ نیلا اور نہ ہی پیلا ہٹ مگر تاریکی کاغذ پہ اپنا بسیرا کرنے سے باز نہیں آتی۔

کچھ تڑے مڑے پینسل اسکیچ کوڑے دان سے باہر جھانک رہے تھے۔ اس اسکیچ میں موجود عورت کی آنکھیں مجھے خود پر گھورتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل ہی کوڑے دان میں نئی پلاسٹک کی تھیلیاں لگائی گئی تھیں اور ان کاغذات کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ ہسپتال کا کچرا عموماً تین الگ طرز کے ڈبوں میں ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ اسے مناسب طور پر ٹھکانے لگایا جاسکے۔ وہ نیلے رنگ کی تھیلی والی عام کچرے کی ٹوکری تھی جو وارڈ میں موجود تھی۔ میں نے خاموشی سے وہ خاکے باہر نکالے اور اپنی میز پر پھیلا دیے۔ گائنی وارڈ میں اُس رات زیادہ مریضائیں نہ تھیں۔ چند ڈیلیوریز سی سیکشن کے ساتھ دن کے

وقت ہی سینئر ڈاکٹر نے نپٹا دی تھیں۔

جب ان خاکوں کا جائزہ لینے لگی تو ساتھ ہی اسی دن کی تاریخ کے ساتھ ڈسچارج شیٹ، نسخے کی پرچی اور لیبارٹری رپورٹ بھی تھی۔ مجھے اس مریضہ کی بے پروائی پر سخت غصہ آیا۔ بھلا ڈی این سی کے بعد فارمیسی سے دوائیں لینے کی بجائے نسخے کو یوں کچرے میں پھینکنا تھا؟ اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے تو یہی مریض ڈاکٹر کے سر چڑھ دوڑتے ہیں۔

لیکن وہ اسکیچ جو ہسپتال ڈسچارج شیٹ کے ساتھ لپیٹے ہوئے تھے، عام سے خاکے نہ تھے۔ بہت مہارت سے بنے ہر اسکیچ میں ایک ایسی عورت کا سراپا نمایاں تھا جس کی آنکھوں میں درد کی لہریں بہت واضح تھیں۔ مختلف زاویوں سے بنائے گئے خاکوں میں دوسری اہم چیز وہ خنجر تھا جو ہر خاکے میں عورت کے پیٹ میں گھونپا گیا تھا۔ وہ خاکے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے درد اور خوف کی ملی جلی سرد رو میری ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں سنسناہٹ پیدا کرتی گزر گئی۔

سسٹر عندلیب یہ پیشنٹ کون تھی جس کی آج ڈی این سی ہوئی؟

میں نے وارڈ میں موجود نرس سے دریافت کیا۔

میڈیم وہ ایک ینگ اور خوب صورت لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کے ان لاز بھی تھے۔ یہ ابارشن انھوں نے خود کروایا ہے۔

لیکن یہاں ڈسچارج شیٹ میں تو مسڈ ابارشن درج کیا گیا ہے۔ ایسے ابارشن کرنا اور رپورٹ میں کچھ اور لکھ دینا درست نہیں ہے۔ میں نے سسٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

آپ بھی بہت بھولی ہیں .... پرائیویٹ ہسپتال میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ جو مینجمنٹ کی پالیسی ہے، آپ کو اسی کے مطابق چلنا چاہیے میڈم۔

نرس نے مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن میں اس کی مسکراہٹ نظر انداز کر کے پھر سے ان خاکوں میں کھو چکی تھی۔

اگلی ہی رات نائٹ ڈیوٹی کے دوران بائیس تئیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی اپنی ماں کے ساتھ درد سے تڑپتی گائنی وارڈ میں آئی۔ اس کا ہاتھ پیٹ کے نچلے حصے پر دھرا تھا۔ ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور رنگت میں پیلاہٹ گھلی ہوئی تھی۔ شدّتِ درد سے وہ کھڑی بھی نہ ہو پا رہی تھی۔

سسٹر نے آ کر چپکے سے مجھے کہا، یہ وہی لڑکی ہے جس کی کل ڈی این سی کی گئی ہے۔

اسالہ ادھر آ کر بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ میں نے چارٹ پر اس کا نام پڑھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ وہ مریضہ نقاہت زدہ چال چلتی بیڈ پر آ کر لیٹ گئی، اس کے چہرے پر شدید درد کے تاثرات تھے۔ میں نے ہاتھوں پر گلوز چڑھاتے ہوئے کہا۔

ہاں اب بتاؤ اسالہ کہاں تکلیف ہے؟

اسالہ نے سر تکیے میں دبا لیا تھا مگر دوسرے کمرے سے مام ڈیڈ کے جھگڑے کی آوازیں اتنی بلند تھی کہ کانوں میں پگھلے سیسے کی مانند اتر رہی تھیں۔ شور شرابا ختم ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔ انٹیریر ڈیزائینر نے اس کے کمرے کی ہر دیوار پر الگ الگ رنگ کا پینٹ اور اسی مطابقت سے فرنیچر کی آرائش کی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سارے رنگ اس کے اردگرد ایک سپنر کی مانند گھوم رہے ہیں اور ان رنگوں کے دائرے میں مقید اس کا سر بری طرح چکرا رہا ہے۔

اسے سفید رنگ بہت پسند تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس کے کمرے میں سادہ فرنیچر کے ساتھ سفید پینٹ ہوتا۔ مگر اس کی ماں نے کبھی اس کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی دیکھتیں کہ کون سا برانڈ اِن ہے، کون سا ڈیزائینر اچھا ہے۔ لوگ ان کے انتخاب اور پسند کی داد دیتے نہ تھکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے ماں باپ شاید ہی کبھی کسی بات پر متفق ہوئے ہوں۔ اور اس لیے والدین کے جھگڑے ان کے گھر کا

معمول تھے مگر وہ کبھی اس معمول کی عادی نہ ہو سکی اور ہر نئی لڑائی پر بُری طرح پریشان ہو جاتی۔

گہرے نیلے رنگ کے وال کلاک کی چھوٹی سوئی دو کے ہندسے پر پہنچ چکی تھی۔ اگلے دن اس کا اکنامکس کا مڈ ٹرم ٹیسٹ تھا۔ وہ یونی ورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں گولڈ میڈل کی دوڑ میں شامل تھی مگر اسے میڈلز اور اعزازات سے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ دلچسپی تھی تو سفید کاغذ سے جس پر وہ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے بیٹھتی تو خود بخود کوئی شبیہ ابھر آتی۔ اُس وقت بھی اسالہ نے اپنی سائیڈ ٹیبل سے ایک چارکول اٹھایا اور اسکولر پیرول پیپر پر سیاہ لکیریں خود بخود اس کی انگلیوں سے پھسلنے لگیں۔

یہ کیفیت بچپن سے اس کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔ وہ کئی بار غائب دماغی کی سی کیفیت میں پینسل سے کوئی اسکیچ بنانے لگ جاتی پھر جو تصویر اس کے سامنے نمودار ہوتی وہ اس کی سوچ اور ارادے میں اُس طرح موجود نہیں ہوتی تھی۔

جب وہ اس کیفیت سے نکل کر مکمل ہوش وحواس کے ساتھ اپنے ہاتھ کے بنے خاکے دیکھتی تو تکلیف میں مبتلا چہرے، ڈریگن، نا مانوس زمینوں کے لینڈ اسکیپ، عجیب وغریب پرندے، خوابناک مناظر اور پھندوں میں الجھے جانوروں کے خاکے خود اس کا اپنا دل دہلا دیتے۔ اکثر و بیشتر وہ یہ اسکیچ چھپا دیتی اور کسی کو اپنی ڈرائنگ نہ دکھاتی۔

اس کا بچپن مشرق وسطیٰ میں گزرا تھا۔ سائیٹ پر جہاں اس کے والد کو رہائش ملی تھی وہاں قرب و جوار میں کسی پاکستانی خاندان کا گھر نہیں تھا۔ انٹرنیشنل سکول میں تعلیم کے دوران اس کی کوئی سہیلی ہم وطن نہ تھی۔ مختلف قومیتوں کے ساتھ گھلتے ملتے اس کے مزاج پسند اور سوچ میں بہت تنوع آچکا تھا۔ او لیول کے بعد انھیں پاکستان واپس آنا پڑا۔ کالج میں اس کی ماں نے اسے فائن آرٹس کا مضمون نہیں رکھنے دیا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی اچھے سے آرٹ کالج میں داخلہ لے، پینٹنگ اور کیلی گرافی اس کا پہلا شوق تھے مگر اسے اکنامکس اور فنانس پڑھنے پر لگا دیا گیا۔

اکثر و بیشتر وہ اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی۔ ماں باپ کو اپنے جھگڑوں سے فرصت نہیں تھی کہ اس کی کم آمیز طبیعت پر غور وفکر کرتے۔ پاکستان آ کر اس کا چھوٹا بھائی جِم، انٹرنیٹ اور کار ریسنگ کے مشاغل میں اپنا بیشتر وقت صَرف کرنے لگا تو مزید تنہائی اس کی زندگی میں سائیں سائیں کرنے لگی۔

وہ پنڈولم کی مانند کبھی کان پھاڑ دینے والے شور اور کبھی سمندر کی عمیق کھائیوں جیسے گہرے سکوت کے بیچ میں ڈولتی رہتی۔ اس کی پسند بھی ایسی ہی ہو چکی تھی اسے بیک وقت ہیوی میٹل میوزک اور کلاسیکل غزلیں پسند تھیں۔ پنجابی و سرائیکی صوفی شعراء سے لے کر روسی اور جرمن ادیبوں تک کی تصنیفات سے شغف اس کے دل و دماغ میں ایک الگ جہان بسائے ہوئے تھا۔

ہزار ہا طوفان اپنی گہرائیوں میں سمیٹے وہ سطح سمندر کی مانند پرسکوت تھی مگر سکون کو دوام نہیں اور اس کی ذات کے سکوت میں پھینکا جانے والا بڑا کنکر اس کی منگنی کی خبر تھی۔ جانے کب اس کی ماں نے اس کا رشتہ دیکھا باپ نے لڑکے کی ملازمت، اس کی آمدنی اور خاندان کی سرسری جانچ کروائی اور کب ہاں کر دی گئی۔ ایک مہینے کے اندر ہی منگنی کی بجائے شادی کا غوغا اٹھا اور اسالہ ہکا بکا اپنی زندگی کا فیصلہ ہوتے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کا ان سب معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

وہ بہت روئی۔ اپنی زندگی کے کسی ایک فیصلے میں وہ خود بھی شامل ہونا چاہتی تھی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ اس کی ماں سب کو یہ وضاحت دے کر مطمئن کرتی رہی کہ لڑکیاں اپنی شادی پر میکے کی جدائی میں رویا ہی کرتی ہیں۔ اور اسالہ ریشم کے تاروں میں پڑی الجھنوں کو سمیٹے ریشم میں لپٹی نئے گھر سدھار گئی۔

کم سن جوڑا نئے خواب نئی امنگیں، دو جسم تو ملے مگر دو روحیں نہ مل پائیں۔ پسند نا پسند، سوچ، خیالات اور طرزِ زندگی میں اتنا تفاوت تھا کہ اسالہ کو سمجھ نہ آیا کہ سب معاملات میں توازن کیسے برقرار رکھے۔ اس کے سسرال والدین سے قدرے کم مالی

حیثیت رکھتے تھے۔ رہن سہن میں بھی بہت فرق تھا۔ ان لوگوں کے اسالہ کے میکے سے وابستہ کئی مالی مفادات ان کی امیدوں کے مطابق پورے نہ ہوئے تھے۔ اس بات کا قلق بہت جلد ان کے رویوں میں بھی جھلکنے لگا تھا۔

لیکن اندیشوں اور وسوسوں کی زمینوں پر وصل کی بارشیں برسیں اور اسی دوران امید کی ایک ننھی کونپل اس کے رحم سے کیا پھوٹی کہ اسالہ کی بے رنگ زندگی میں سبزہ لہلانے لگا اور بھید بھری خاموشیوں کے باوجود دھیما سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں رہنے لگا۔

اس ننھی کونپل کو تصور میں لا کر اس نے فیصلہ کیا کہ لاکھ پتھریلی راہیں قدموں تلے بچھی ہوں وہ اپنے والدین کی مانند جھگڑالو نہیں بلکہ اچھی ماں اور اچھی بیوی بنے گی۔ زن وشو کے بیچ محبت و ذہنی ہم آہنگی کا پودا دھیرے دھیرے پنپتا ہے۔ اسالہ کو امید تھی کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنا کر ہم آہنگی کے پودے کو اپنی اولاد کے لیے وہ شجر سایہ دار بنا سکے گی جو اسے میسر نہ آسکا تھا۔ شادی کے دو مہینے بعد اس کا شوہر اپنی ملازمت پر واپس دبئی چلا گیا اور اسالہ کو وہاں بلوا لینے کی تیاری کرنے لگا۔ جب اسے سسرال میں کسی بات پر رنج پہنچتا وہ اپنی ماں کی طرح احتجاج کرنے یا چیخنے چلانے کی بجائے خاموشی سے اپنے کمرے تک محدود ہو جاتی۔

بابر تمھیں ہر صورت اسالہ کو طلاق دینا ہوگی۔ اسالہ کا جیٹھ اس کے شوہر کو فون پر سختی سے کہہ رہا تھا۔

مگر بھائی آخر کیوں؟ کیا برائی ہے اسالہ میں؟

بابر نے سوال کیا۔

وہ نفسیاتی مریض ہمارے خاندان کا حصہ نہیں بن سکتی۔

مگر بھائی میں تو اسے بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا تھا وہ نفسیاتی مریض کیسے ہو گئی؟

پھر طویل بحث کے بعد وہ زچ ہوتے ہوئے کہنے لگا: اچھا اگر نفسیاتی مریض ہے بھی تو اتنی سی بات پر کیوں طلاق دوں اسے؟ جبکہ وہ پریگنینٹ بھی ہے۔ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

بابر حیران و پریشان تھا کہ ان چار مہینوں میں ایسا کیا ماجرا ہو گیا جو سارا خاندان اسالہ کے اتنا شدید مخالف ہو چکا ہے۔

بھائی بہنوں کے ساتھ چند دنوں تک بحث تکرار جاری رہی پھر ایک دن اس کے باپ کا فون آیا۔

دیکھو بابر اسالہ کو طلاق دے دو، ہم اسے نہیں رکھ سکتے۔ اس کا باپ بہت چالاک ہے۔ اس کی ماں دھوکے باز ہے۔ بہت سی باتیں ہم سے چھپائی گئیں۔ کئی وعدے پورے نہیں کیے اس کے باپ نے۔

مگر بابا اس بات پر میں اسالہ کو طلاق کیوں دوں؟

بابر حیرت سے پوچھنے لگا۔

اس لڑکی کو شیزوفرینیا ہے۔ اس کی ماں نے یہ بات ہم سے چھپائی تھی۔

یہ جواب سن کر بابر ہکا بکا رہ گیا ....

مگر بابا اس شیزوفرینیا کا مجھے دو مہینوں میں پتا کیوں نہیں چلا؟

وہ اس لیے کہ اس کی ماں اسے دوائی کھلا دیتی تھی۔ تمھاری بڑی بھاوج نے اس پر سختی کی میکے جانے سے روکا۔ جب اسے بروقت دوا نہ مل سکی تو اس پر شیزوفرینیا کے دورے پڑنے لگے۔

وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ تم جانتے ہو تمھاری بڑی بھابھی کئی برسوں بعد امید سے ہیں۔ اس بد بخت اسالہ نے ایک حاملہ عورت کے خاکے بنا کر اس کے پیٹ میں خنجر گھونپے ہیں۔ وہ خاکے تمھاری بھابی کے ہاتھ لگ گئے۔ تمھارا بھائی سخت غصے میں ہے۔ وہ پاگل نفسیاتی مریضہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہنے والی، تمھاری بھابھی کے

بچے کی جان لینا چاہتی ہے۔ اسے فوراً طلاق بھجواؤ۔

باپ کا حکم سن کر بابر بھی الجھ گیا۔ پھر پوچھنے لگا:

بابا میرے بچے کا کیا ہوگا۔ اسالہ بھی تو ماں بننے والی ہے۔ طلاق کے بعد بچے کی کسٹڈی کے مسائل پیدا ہوں گے۔

تم فکر نہ کرو اس کا بندوبست ہم کرلیں گے۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔

اور بابر پورے خاندان کے دباؤ کے سامنے ہار گیا۔

اسالہ کو بتائے بغیر چیک اپ کے بہانے ہسپتال لایا گیا اور اس کا حمل ضائع کروا دیا گیا۔ ہسپتال سے ہی اس کی ماں کو فون کیا گیا کہ آ کر اپنی بیٹی کو لے جاؤ اسے بابر نے طلاق بھجوا دی ہے۔

مجھے شاید یہاں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ ان ہسپتالوں میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

ہسپتال کے کوریڈور سے ابھرنے والی ڈاکٹروں کی آوازیں کب سے ختم ہو چکی تھیں مگر درد کے رنگوں کا ذکر مجھے پھر سے لکھنے کے گہرے موڈ میں لے گیا تھا اور اس معصوم سی لڑکی کا چہرہ بار بار میرے تصورات میں آتا رہا۔

اسالہ بعد میں بھی فالو اپ کے لیے میرے پاس کلینک آتی رہی۔ وہ بہت معصوم سی خوش لباس لڑکی تھی۔ اس دوران اس نے خود پر بیتی کہانی کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں میرے گوش گزار کر دی تھی۔

جب وہ کسی پرانے واقعے کا ذکر کرتی تو اس کی آنکھوں میں درد کی لہریں اُسی طرح نمایاں ہو جاتیں جیسے خاکوں میں موجود عورت کی تھیں۔

میں پروفیشنل گائینا کولوجسٹ ہونے کے باوجود لکھنے سے بھی شغف رکھتی ہوں اور خوب سمجھتی ہوں کہ کسی آرٹسٹ، مصنف یا شاعر کا تعلیمی پس منظر یا پیشہ کچھ بھی ہو اگر فن اس کو فطرت نے ودیعت کیا ہے تو وہ تخلیقی وفور سے منہ نہیں موڑ پاتا۔ بے شک وہ

اپنا فن اور تخلیقات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہی کیوں نہ رہنے دے۔ لیکن تخلیق کرنا نہیں چھوڑتا۔ کئی بار یہ فن پارے ایک خاص ٹرانس یا آمد کی کیفیت میں جا کر تخلیق ہوتے ہیں۔ کیا یہ محض فنکاروں کے تجربات و مشاہدات ہوتے ہیں یا آمد کی کیفیت کسی اور شے کی بھی عکاس ہوتی ہے؟ مگر میرے لیے اس سوال کا جواب ہمیشہ تشنہ ہی رہا۔

میں بہت دنوں تک سوچتی رہی کہ آخر اسالہ کے ہاتھوں سے بنے خاکے کیا تھے؟ خنجر تو اسی کے رحم میں گھونپا گیا تھا۔ کیا اسالہ کو کہیں سے ادراک ہوا تھا کہ اس کے رحم میں ہی اس کے بچے کو مار دیا جائے گا۔ مگر اسے تو یہ بھی پتا نہ چلا کہ کلینک معائنے کے لیے نہیں بلکہ کھوکھ اجاڑنے کے لیے لائی گئی ہے۔

پھر اس کے ہاتھ سے وہ خاکے کیونکر بنے جن کی پاداش میں اس کی جیٹھانی نے اسے طلاق دلوا کر ہی چھوڑی اور وہ اسکیچ ہسپتال کے کاغذات کے ساتھ کچرے میں پھینک گئی۔

کیا تخلیق فطرت کا کوئی کوڈ ورڈ ہے؟

کیا فن وجدان کی کوئی شکل ہے؟

اگر یہ وجدان ہے تو کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے؟

وقت کی گرد میں بھی بڑے بڑے فن پارے دفن ہو جاتے ہیں قصر الاحمر جیسے محل بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ علم و تہذیب اور فن کے گہوارے شہر کھنڈرات کے ڈھیر اور عظیم الشان تہذیبیں کمتر جنگجو اقوام کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندی جاتی ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کسی ایک کے لیے بہت اہم تخلیق دوسروں کے لیے محض ردی ہوتی ہے اور انمول انسان کسی دوسرے کے لیے فقط خون کے چند قطرے۔ اولاد کسی کے لیے عمر بھر کی سب سے بڑی تشنہ خواہش اور کسی کے لیے فالتو شے کی مانند۔ لیکن ان سب کے باوجود فطرت کئی فن پاروں کو وقت کی دست برد سے محفوظ

رکھتے ہوئے انھیں قدر دانوں تک بھی پہنچا دیتی ہے۔

سردیوں کی طویل نائٹ شفٹ میں کبھی چند فقرات قلم بند کرنے کے لیے وقت نکال پاتی اور کبھی مریضوں کی مصروفیت میں اسالہ کا چہرہ میرے تصور میں شا کی نظروں کے ساتھ اپنے خاکوں کے تسلسل میں کہانی لکھے جانے کا مطالبہ کرتا رہتا۔ کیا ایک تخلیق کے تسلسل میں دوسری تخلیق کسی اور فنکار سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو آخر کیوں؟ شاید یہ فن پارے بے جان ہو کر بھی کسی نہ کسی سطح پر پیغام رسانی کرتے ہیں۔

اسالہ کو کوئی نفسیاتی مسلہ تھا یا نہیں اس سے قطع نظر مجھے اس کی دردناک کہانی نے .... نہیں صرف کہانی نہیں .... بلکہ ان خاکوں نے اور اسالہ کی intuition نے اپنا اسیر بنایا ہوا تھا۔

کہانی تقریباً مکمل ہونے کو ہے بس مجھے اس کا اختتامی سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔ ٹھہریں ذرا ابھی ایک عورت دردزہ کے ساتھ ایمرجنسی میں آئی ہے۔

رائٹنگ پیڈ لیبر روم کی میز پر رکھ کر میں نے جلدی سے نیلا گاؤن اور گلوز پہنے۔ مجھے امید تھی نارمل ڈیلیوری ہوگی۔ مگر اس خاتون کو دیکھنے سے قبل ہی انٹر کام پر مجھے ایڈمن آفس میں بلا یا لیا گیا۔

میں سٹاف نرس کو مریضہ کی فائل پکڑاتے ہوئے جلدی سے ایڈمن آفس پہنچی۔ جہاں ہسپتال کی انتظامیہ نے اپنے مقرر کردہ اہداف حاصل نہ کر سکنے کے باعث مجھے ملازمت سے برطرفی کا نوٹس پکڑا دیا۔ غیر ضروری آپریشن اور غیر قانونی اسقاط پر چند ایک بار میرے دبے دبے احتجاج سامنے آ چکے تھے۔ لیکن بات ملازمت سے برطرفی تک پہنچ جائے گی، مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا۔

اس اچانک افتاد پر میں کچھ دل گرفتہ سی اپنا بیگ اور دیگر چیزیں لینے واپس لیبر روم پہنچی۔ وہاں اسٹاف نرس میرے تحریر کردہ صفحات اور کچھ دیگر کاغذات پیلے رنگ کی نشان زدہ کلینکل ویسٹ بن میں پھینک رہی تھی۔ جس میں متعدی بن سکنے والی اشیاء ہی

ڈالی جاتی ہیں۔

اوہ نو سسٹر یہ آپ نے کیا کیا؟ اس میں تو میرے اہم کاغذات تھے۔

سوری میڈم مگر ان کاغذات میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ میں نے خود چیک کیا تھا، صرف چند ڈرائینگز اور لیڈ پینسل سے لکھی آڑھی ترچھی تحریریں ہی تھیں۔

سسٹر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھی کہ اگر پیلی پلاسٹک کی تھیلی صاف ہوئی تو وہ صفحات واپس نکال لوں۔ مگر وہاں سرخ رنگ سے بھرے ٹاولز میرا منہ چڑا رہے تھے۔

درد کی لہریں سرخ بھی ہوتی ہیں؟

کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے۔

اپنے ہی لکھے الفاظ میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

کوڑے دان سے اپنی لکھی کہانی کے صفحات کیسے باہر نکالوں یا اپنی تخلیق کو کچرے میں چھوڑ کر خاموشی سے چلی جاؤں؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اسٹاف نرس نے کڈنی ٹرے میں رکھی ہوئی آنول پیلے رنگ کی نشان زدہ کچرے کی ٹوکری میں ان صفحات کے اوپر ڈال دی۔

◆

گگڑی

فہمیدہ کو اپنے ہی محلے کے متمول گھرانے میں کام کرتے ابھی صرف دو دن ہی ہوئے تھے کہ کام سے جواب مل گیا۔ گھر کی مالکن بیچاری کیا کرتی، آخر وہ گھر کا کام صفائی ستھرائی کے لیے کراتی تھی نہ کہ گھر کو مزید بدبودار بنانے کے لیے۔ اور فہمیدہ، اس کو بہت سوں نے سمجھایا کہ صاف ستھری رہا کرو مگر اس کے کان پر تو جوں بھی رینگنے والی نہ تھی۔ وہ اتنی میلی کچیلی اور بدبودار تھی کہ جہاں سے گزرتی پہلے بدبو کا بھبھوکا نمودار ہوتا۔ لوگ اپنی ناک بند کر لیتے۔ گلی میں سے گزرتی تو گھر کے اندر بیٹھی عورتیں بھی اس کی موجودگی سے باخبر ہو جاتیں۔ اس کے سنہرے رنگ کے گھنگھریالے سے بال جو برسوں سے کنگھی سے محروم تھے، کندھوں تک جھولتے رہتے۔ ان کے اندر مٹی تنکے دھاگے اور نجانے کیا کچھ اٹا پڑا تھا۔ قد اونچا لمبا، رنگ کبھی گورا ہو گا مگر ہلکے بھورے دھبوں نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی، ناخن گِھس چکے تھے مگر میل کی لکیریں بہت نمایاں نظر آتیں۔ کپڑے بدلنے یا دھونے کی فرصت کسے نصیب تھی۔ جب گِھس کر پھٹنے کے قریب ہوتے تو کوئی دوسرا جوڑا زیب تن کرتی، پھر وہ مہینہ بھر اور کبھی اس سے بھی زیادہ دن چلتا۔ اس نے کبھی سر پر دوپٹہ نہیں اوڑھا تھا مگر گلے اور چھاتی کو لپیٹے رکھتی تھی۔ پاؤں میں قینچی چپل پہنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی تو عجیب بے ہنگم آوازیں نکلتیں۔ یہی حال کچھ اس کے گھر کا بھی تھا۔ وہ ایک نچلے

درمیانے طبقے کے محلے میں رہتی تھی۔ پانچ مرلے کا گھر تھا جس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔صرف دو کمرے اپنے پاس رکھ کر باقی گھر معمولی کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔گھر میں گندگی کا بسیرا تو ہونا ہی تھا۔کوئی دروازہ آدھا ٹوٹا ہوا تھا تو کسی بھی کھڑکی کو جالی یا پردہ نصیب نہیں تھا۔فرش جانے کب سے اکھڑ چکا تھا یا تھا ہی نہیں، صرف سرخ اینٹیں نمایاں تھیں۔کوئی اس کے پاس بیٹھنا تو درکنار قریب کھڑے رہنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

اسے کبھی کسی نے مسکراتے یا روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، چہرہ سپاٹ مگر آنکھوں میں ایک کرب سا بہت نمایاں تھا۔کبھی کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے شدید سر درد میں مبتلا ہو۔ بولتی بھی بہت کم تھی اور مزاج بہت روکھا، نہ بحث نہ تکرار، بس جو کام ملتا، کرتی اور اپنی راہ لیتی۔ اب بھلا اتنی میلی کو کام کون دیتا۔ دو چار دن بعد جواب مل جاتا اور ان دو چار دنوں کی اجرت کون دیتا ہے؟

اللہ جو ساری مخلوق کا روزی رساں ہے اُس نے اس گگڑی کی روزی کا وسیلہ بھی نکال ہی دیا۔اسے بھینسوں کے باڑے میں ملازمت مل گئی۔کوئی دوسری عورت یہ کام نہ کرتی مگر اس کے ساتھ پانچ وجود اور بھی تھے، ان کے پیٹ کا دوزخ بھرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔اور جب پیٹ کا دوزخ جل رہا ہو تو جنت کمانے کی فکر کسے ہوتی ہے۔اسے کسی نے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا اور جہاں روز فاقے ہوں، روزے کا کیا پتا چلتا، رکھا یا چھوڑ دیا۔ایسے حلیے میں بھلا نماز ادا ہوتی ہے؟ جمعہ تو درکنار اسے شاید عید کے دن بھی ستھرے کپڑے نصیب نہ تھے۔عید بھی بھینسوں کا گوبر اٹھاتے گزرتی۔ باڑے کا مالک بھی اسے یونہی تنخواہ نہیں دیتا تھا۔کوئی مرد بھی اتنے کم پیسوں میں اتنا سخت کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور اوپر سے گگڑی عید شب برات کو بھی چھٹی نہیں مانگتی تھی۔

بھینسوں کے باڑے میں کام کوئی آسان نہ تھا مگر بھینسیں اتنی وحشی نہیں ہوتیں۔ اسے ان سے کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مالک پیسے کی پائی پائی کا حساب رکھتا مگر گگڑی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ دوسرا فائدہ ادھر کام کرنے کا یہ تھا کہ جب مشین لگا کر مکھن

نکالا جاتا تو باقی بچی چھاچھ میں سے کچھ گگڑی کو دے دی جاتی۔ چار بیٹے اور ایک بیٹی سارا دن گھر میں اکیلے پڑے رہتے وہ دن میں کئی بار گھر کا چکر لگاتی۔ اس کے بچوں نے کبھی کسی سے نوالہ بھی نہیں مانگا تھا، پتا نہیں وہ کب پکاتی اور کب انھیں کھلا کر منہ اندھیرے کام کو نکل کھڑی ہوتی۔

ملکانی جی جن کا بیٹا کئی دنوں سے بخار میں جل رہا تھا، کبھی پیروں کبھی مولویوں اور کبھی ڈاکٹروں کے چکر کاٹ کاٹ کر عاجز آ گئی تھی۔اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، آستانے پر نذرانہ چڑھایا، مولوی صاحب سے دم کرایا، دوا دارو سب کر کے دیکھ لیا، کچھ افاقہ نہ ہوا۔ ملکانی بے چین ہوگئی۔ اکلوتے بیٹے نے کئی دنوں سے گلوکوز کے علاوہ کچھ کھایا نہ پیا۔ سوچ میں پڑ گئی، یا الٰہی کیا کروں؟ کسی نے کہا خون کا صدقہ دے۔ اس نے کالے رنگ کا دیسی پلا ہوا مرغا منگوایا اور فہمیدہ کو بلا بھیجا۔ پوچھا، فہمیدہ صدقہ لوگی؟ فہمیدہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی وحشت آخری حدوں کو چھونے لگی۔ پھر نظر جھکا کر بولی میں صدقہ نہیں لیتی۔ ملکانی نے کہا کوئی بات نہیں اب لے لو تمھارے بچوں نے شاید پچھلی بقر عید کا گوشت کھایا ہوگا۔ پھر جب اس کی نظر فہمیدہ کی نظر سے ملی تو وہ سہم گئی اور کہنے لگی، اچھا جاؤ کسی اور گھر میں دے آؤ۔ فہمیدہ نے مرغا بغل میں دابا اور مولوی صاحب کے گھر کو چل دی۔

لوگ اسے طرح طرح کی باتیں کرنے لگ گئے۔ کوئی کہتا اکڑ بڑی ہے اس کے اندر، کوئی کہتا بے نمازی ہے کوئی کہتا گگڑی میلی، کوئی کہتا اسے دین دنیا کا کچھ نہیں پتا۔ گگڑی کوئی پڑھی لکھی عورت تو تھی نہیں اسے بس اتنا پتا تھا کہ پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ جہنم کی آگ پیٹ کی آگ سے لگی ہے۔ اگر کوئی حلال طریقے سے اِس دوزخ کی آگ کو بجھا سکے تو اُس دوزخ کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر صرف ایک روٹی، ایک نوالے اور ایک وقت کے کھانے سے بجھنے والی آگ بجھانے کی فکر کوئی نہیں کرتا، جہاں لوگ اپنے نفس کی بھوک کے بھانبڑ لگائے بیٹھے ہوں انھیں اس سے کیا

غرض کہ پیٹ کا دوزخ کیا ہوتا ہے۔

اس کے محلے کی نکڑ پر بڑے بڑے منجوں اور موڑھوں پر بیٹھے شرفا، سیاسی کارندے، انتخابی دفتر والے وہاں سے گزرنے والی ہر عورت کو گھورنا اپنا حق سمجھتے تھے، بھلا گگڑی کیسے ان کی نظر بازی سے کیسے محفوظ رہتی۔ مگر گگڑی کو کچھ کہتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔ اس کی کم گوئی اور آنکھوں کی وحشت دیکھ کر سب سہم جاتے۔ ایک دن نئے کونسلر کو جانے کیا سوجھی کہ گگڑی کو چھیڑ بیٹھا۔ اری او فہمیدہ گگڑی، جگہ جگہ کام کرتی پھرتی ہے۔ لوگوں کے گھر صاف کرتی ہے اپنے گھر کی اور اپنی صفائی بھی کرلیا کر۔ یہ سننا تھا کہ منجوں پر بیٹھے سب آدمی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ ایک شخص بولا کچھ مت کہہ گالیاں سنائے گی۔ دوسرا بولا سنانے دے وہی تو سننی ہیں۔ گگڑی کا چہرہ پہلے سرخ ہوا پھر پیلا زرد، گلا رندھ گیا، مگر آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ بڑے جلال سے بولی ارے جب میاں جی زندہ تھے تو بھرجائی بھرجائی کرتے تیری زبان نہ تھکتی تھی۔ خیرات لینے، قرض لینے میرے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا۔ او نامراد اب ہر آتی جاتی کو تکتا ہے۔ مشرک کہیں کا، پھر کسی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ رندھے گلے کے ساتھ کیا کیا بولے گئی۔ شور سن کر گگڑی کے چاروں بیٹے آن موجود ہوئے جو سوکھی روٹی اور چھاچھ پر پل کر یوں کڑیل جوان بنتے جا رہے تھے گویا گھی مکھن پر پل رہے ہوں۔ کونسلر نے گھبرا کر گھر کی راہ لی۔ شام تک سارے محلے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی کہ کونسلر کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

وہ دن گگڑی کے کام کا آخری دن تھا، بیٹے بڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے گھر سنبھال لیا۔ پھر ایک دن گگڑی نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر دی۔ گھر میں بہو آئی تو اس کو فراغت نصیب ہوئی۔ اب وہ گگڑی نہیں رہی تھی۔ اس نے کہیں آنا جانا بالکل کم کر دیا تھا اور سادگی کے باوجود اس کا حلیہ بھی بہتر ہو گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کا امتحان ختم ہوا۔ مگر نہیں ایسا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی بہو کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، بہو بڑی سلیقہ شعار

اور گھر داری کی ماہر تھی۔ اور اسے اس بات کا بڑا ناز تھا۔ گگڑی نے گھر کے کسی معاملے میں دخل اندازی کرنا چھوڑ دی تھی۔ ایک دن بہو کہنے لگی یہ گھر میری سلیقہ شعاری سے سجا ہے میری ساس تو گگڑی ہے اس کو تو کچھ پتا نہیں کہ دنیا کیا ہوتی ہے اور کدھر جا رہی ہے۔ ساری عمر خود بھی میلی رہی گھر بھی میلا رکھا۔ گگڑی سے یہ تہمت برداشت نہ ہوئی۔ صدمے سے فالج کا حملہ ہوا اور گگڑی بیچاری چارپائی سے جا لگی، بیٹوں نے بڑی خدمت کی، بڑا علاج کروایا۔ مگر اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ جن انگاروں پر چلی، گگڑی کا سوانگ بھرا، کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ ایک اونچی ذات کی عورت بیوہ ہو کر بھیڑیوں سے بھری اس دنیا میں گگڑی کیوں بن جاتی ہے؟

بیماری کی حالت میں ایک دن بہو سے کہنے لگی، اللہ سدا سہاگن رکھے تجھے۔ جوانی کی بیوگی کاٹنی بڑی مشکل ہے۔ بہو کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو آ گئے۔ اسے جب تک سمجھ آئی بہت دیر ہو چکی تھی۔ واپسی کے سفر میں سفید لباس پہنے گگڑی بہت اجلی لگ رہی تھی۔ چاروں بیٹوں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے ماں کی چارپائی اٹھا لی اور اسے اس کی آخری منزل کی جانب لے کر روانہ ہو گئے۔

طلوعِ ماہتاب

فلک کے کناروں کو دبیز دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور گہرے اندھیرے میں زمین پر ستاروں کی ٹمٹماتی لویں پہنچنے کے کوئی آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ فلک بوس برفیلی چوٹیوں اور برف سے ڈھکی وادیوں میں چاند کو دیکھ کر ہوکنے والے جنگلی بھیڑیے شکار ناپید ہونے کے بعد دائرہ بنائے بیٹھے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے غُرا رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کب کسی ایک کی پلک جھپکے اور باقی سب اس کی بوٹی بوٹی کر دیں۔ ٹھٹھرتے جگنوؤں نے جنگل کی راہ بدل لی تھی۔ بانسری بجانے والے نچلی وادیوں میں اتر گئے تھے یا ڈر کے مارے بھیس بدل کر اس علاقے سے نکل چکے تھے۔ جنوری کی کئی سرد، اندھیری اور طوفانی راتوں کے بعد ہوا ساکت تھی گہرے بادلوں کے پیچھے کہیں روشن راتوں کا چاند موجود تھا مگر وہ بھی شاید ڈرا سہا چھپا بیٹھا تھا۔

لکڑی کے چوکور بکسوں میں بند شہد کی مکھیاں کچھ دن سے ہر خوراک سے محروم تھیں۔ شدید برفباری اور برفانی تودے گرنے کی وجہ سے چیڑ کے کئی درخت اکھڑ کر گرے تھے جن کی ٹوٹی شاخیں بکسوں کو ڈھانپے ہوئے تھیں اور جنگلی پھولوں کے ننھے بیج کئی فٹ برف کے نیچے رت بدلنے کے منتظر تھے۔

زرغونے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ اب باہر کوئی نقل و حرکت نہیں، پشمینے کی شال اوڑھتی ہوئی اپنے نیم خستہ گھر سے برآمد ہوئی۔ اسے گہرے اندھیرے سے ہمیشہ

وحشت ہوا کرتی تھی۔ اس علاقے میں اماوس کی راتیں بھی اتنی اجلی ہوتیں گویا ارب ہا ٹمٹماتے دیے آسمان سے جھک کر نیچے دیکھ رہے ہوں۔ لیکن اس رات آسمان تاریک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور چاروں طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی۔

سب سے پہلے اس نے شہد کی مکھیوں کے بکسوں کے پاس بچے کچھے پھلوں کے ٹکڑے اور شیرہ رکھا اور پھر اپنے صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ گرے پتھر ایک ایک کر کے ترتیب دیتی دھیمی آواز میں کوئی لوک دھن گنگنانے لگی ——

اے ماہتاب طلوع ہو
بھیڑیے بھوک کی رسم نبھا رہے ہیں
کہرے نے رات طویل تر کر دی ہے
مگس آبِ حیات کی تلاش میں ہیں
اے ماہتاب طلوع ہو
بتا ابھی فلک کا کتنا سفر باقی ہے؟

پچھلے سال اس کے بچوں کا سکول بھی اڑا دیا گیا تھا اور اس سال دہشت گردوں کا جزوی صفایا ہونے کے بعد امید تھی کہ ملبے کے ڈھیر میں ہی سہی اس کے بچے آنے والی گرمیوں میں دوبارہ سکول جا سکیں گے۔ کتابوں کے پھٹے اوراق مرمت کر کے اوپر گتے رکھ کر اس نے جلدیں باندھ دی تھیں۔

اسے اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا جنون تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی بھی کہیں تیس ہزار میں فروخت کر دی جائے یا اس کا بیٹا ہیروئین اسمگل کرتا کسی بارڈر پر پکڑا جائے .... جانے تخریب بہادری کی علامت کب سے ٹھہرائی گئی ہے؟

زرغونے کیا صرف تیس ہزار میں تیرے باپ نے تجھے بیچ دیا تھا .... اس کے کانوں میں مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

خوبانی کے درختوں پر بور آیا ہوا تھا۔ اس نے نوعمری کے سپنے دیکھنے بھی شروع نہ

کیے تھے جب ایک بیمار اور بوڑھا شخص میدانی علاقے سے آ کر اس کے باپ کے ساتھ رشتے کا سودا تیس ہزار روپے میں طے کر گیا تھا۔

برفباری کا آغاز ہوا ہی تھا ابھی پھلوں کی فصل بھی تیار نہ ہوئی تھی جب شاخیں چھانگ دی گئیں۔ جب وہ خریدار اسے بیاہ کر میدانی علاقوں میں لے گیا تھا تو زرغونے کے ہاتھ سے لگے خوبانی کے پیڑ کی مانند اس کا اپنا قد بھی پورا نہیں نکلا تھا۔ علاقے کی بیشتر عورتوں کی طرح اس نے اُن رواجوں کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا۔ غربت و جہالت میں پروان چڑھی ان لڑکیوں کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہ ہوتا تھا۔

چند ہی برسوں میں زرغونے کا مجازی خدا نما لباس مسک کر خستہ ہونے لگا..... تن ڈھانپنا مشکل ہوا...... عریانی مجبوری ہوئی یا جبر مگر سکہ رائج الوقت بن گئی۔ وہ اپنے گاؤں کے قریب موجود سرکاری کالونی میں برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے کی ملازمت کرنے لگی اور مفلوج شوہر کی دوا یا دو بچوں کی روٹی کے عوض بڑے صاحب سے لے کر چھوٹے صاحب تک کے بدن کا میل اپنے بدن پر ملوا لیتی رہی۔

''تو گناہ گار نہیں ہوتی زرغونے'' _____ باورچن اسے کہتی۔

کس بات کی گناہ گار ....روٹی کمانے کی.........؟

وہ میرا باپ ہوا گناہ گار .... کلمے پڑھوا کر چھوٹ جائے گا؟

اور وہ بڈھا جانے کتنے ہزار کما کر اس کی ہتھیلی پر دھر چکی ہوں .... وہ ہوا گناہ گار..........؟

اور زرغونے اُسی طرح اجلی کی اجلی اور نکھری نظر آتی جیسی پہاڑوں سے رخصت ہوتے وقت تھی۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں ڈنگ کی سی تلخی سنائی دے رہی تھی۔

پچیس کا سن چڑھا تو بیوگی نے آن لیا اور وہ میدانوں سے پھر برفوں میں لوٹ آئی۔

موسم بدلا، درخت پھر بور سے لدنے لگے اور مگس نیا چھتا سینچنے میں لگی ہوئی تھیں جب اس کا دوسرا شوہر سنگین خان اس کی گود میں اپنے دو بچے ڈال کر خود بندوق اٹھائے شدت پسندوں کے سنگ ہولیا۔

مرغزاروں میں ہر نسل اور ہر خطے کے بھیڑیے کھلے بندوں پھرنے لگے۔ ان کی غراہٹیں سماعتوں کو مسموم کیے ہوئے تھیں۔ بارود اور لہو کی بساند سیب لوکاٹ اور خوبانی کی خوشبو پر حاوی ہوگئی اور وہ کتابوں کے ورق ورق اکٹھے کرتی حالات بدلنے کا انتظار کرتی رہی۔

آخر یہ مرد بندوق کو زیور کیوں سمجھتے ہیں۔ وہ تلخی سے سوچتی .... محض بندوقوں سے کبھی حالات بدلے ہیں کیا؟

تپتی دھوپ میں جھلستے پھر برف میں منجمد ہوتے اس کا وجود نئے آہنگ میں ڈھلنے لگا۔ اس نے اتنا سمجھ لیا تھا کہ پڑھ لکھ کر کوئی انسان اخلاقی ضابطوں میں بہتر نہ بھی ہو مگر بہتر زندگی ضرور گزار سکتا ہے۔

وہ اپنے بچوں کو پڑھائے گی ____ اس کا بیٹا پہاڑی غاروں پر نہیں بلکہ چراٹ جائے گا۔ اس کی بیٹی سکول میں استانی لگے گی......... یہی خواب اس کی حیات تھے۔

شہد کی مکھیاں صبح سے شام تک جنگلی پھولوں کا رس اکٹھا کرتیں، چھتے بھرتی رہتیں اور تنگ آکر آئے دن کئی نکھٹو مکھے مار دیتیں۔ اگلی گرمیوں میں جب سیاح ان علاقوں کا رخ کریں گے تو اس کے بچے سکول سے لوٹ کر مرتبانوں میں شہد اٹھائے اسے مرغزاروں دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے بیچنے جائیں گے۔

اگر سیاح آئے .... اگر گھوڑے خچر اور جیپیں یہاں پہنچیں .... اگر بارود کی مہک جامنی پھولوں کی مہک سے دب گئی۔ اس کے صحن میں لگے آلوچے اور خوبانی کے درخت خوب پھل دے دیں تو کتنا اچھا ہوگا۔

اور اگر حالات یہی رہے تو کیا ہوگا؟ وہ تفکّر سے بڑبڑائی۔

کاش یہ عجیب و غریب لوگ جنھوں نے دہشت پھیلا رکھی ہے یہاں کبھی نہ آتے۔ نہ ہی کوئی کمسن ان کے جھانسے میں آتا۔ عورتوں کا بھلا کیا ہے ـــــ ان کی حالت پہلے کمتر تھی اور اب بدترین ـــــ دین و دنیا، مذہب شریعت تو ایک طرف زندہ رہنے کے لیے انھیں نان روٹی کے بھی لالے پڑ چکے ـــــ

نان روٹی اور گوشت کا سالن یہی کھلایا تھا اس کے باپ نے اپنی برادری کو.......
اس کے ولور کی رقم سے اور اس کے جسم کو مقدس کلمات پڑھے پانی کا غسل دے کر دو بار حلال کیا گیا تھا ان فیصلوں کے لیے جن میں زرغونے دل سے کبھی راضی نہ تھی۔

وہ سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش میں پھر سے انگئی گنگنانے لگی۔

سپو گمئے ـــــ

اے ماہتاب طلوع ہو
طویل رات گہرا اندھیرا ہے
لعل و جواہر گلیوں کی خاک چھان رہے ہیں
نان سے روشنی نہیں پھوٹتی
پھولوں کے بیج گہری برف تلے دبے
پھوٹنے کے منتظر ہیں ـــــ

مگر اندھیرے کی وحشت تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دیوار پر پتھر دھرنے کے بعد وہ دبے پاؤں بھیڑوں کے باڑے کی جانب بڑھی۔ اپنے سر کے گرد شال جماتے ہوئے اس کا پاؤں خشک لکڑی پر پڑ گیا، ایک چرچراہٹ ہوئی۔

خاموش ـــــ

سنگین خان سختی سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر غرایا تھا۔ اندھیرے کی وحشت

آخری حدون کو چھو کر ختم ہونے لگی۔ اس کا خوف ہوا ہو رہا تھا۔

ہمارے ساتھ مہمان ہے۔ گھر کے اندر جاؤ اور کچھ چائے قہوہ بھیجو۔ اور خبردار! اگر کسی کو پتا چلا ہمارا ادھر موجودگی کا تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔

پچھلی بار جب سنگین اپنے ساتھی لے کر یہاں آیا تھا تو اسی رات لہو اور بارود کی آندھی کئی گھر اجاڑ گئی تھی۔

زرغو نے بغیر کوئی جواب دیے مضبوط قدم اٹھاتی واپس گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے دہکتے آتش دان میں چند لکڑیاں اور ڈالیں اور کیتلی میں قہوہ دم پر رکھ دیا۔

جب وہ اپنے بچوں پر ڈالا لحاف درست کر رہی تھی تو اسی وقت فوجی جیپیں پورے احاطے کو گھیرے میں لے رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں جوان دھڑا دھڑ عمارت کے اندر کودتے سنگین خان سمیت سب کو مزاحمت کا موقع دیے بغیر گرفتار کر چکے تھے۔

اینٹی ٹیررراسٹ اسکواڈ کے جوان اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوئے تو وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا موبائل فون جگمگا رہا تھا۔ پھر وہ شہد کی مکھیوں کے بکسوں کی طرف لوٹی تو دیکھا کہ آسمان پر بادل چھٹ رہے ہیں اور ہالے میں چمکتا چاند مسکرا رہا ہے ساتھ ہی اربوں ستارے زمین پر جھانک رہے ہیں۔

اے ماہتاب طلوع ہو
اپنی چاندنی بکھیرو
تارے تمھارے ہمرکاب
روشنی کا ورد کریں

◆

سرنگ کے راستے

برقی قمقمے جل بجھ رہے تھے اور آنکھوں کے آگے مٹیالی سی دھند چھائی تھی جیسے در و دیوار پر مٹی اڑ رہی ہو۔ لیکن ہوا بالکل ساکن تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ میں غیر معروف راستے پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کچھ دور جا کر غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ برقی قمقمے نہیں بلکہ مشعلیں تھیں جو مٹیالے راستے کے دونوں جانب نصب تھیں۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا! وہ ایک طویل سرنگ تھی جو بہت کھلی، ہوا دار اور روشن تھی۔ ہر دس پندرہ گز کے فاصلے پر سرنگ کے دونوں جانب مومی مشعلیں روشن تھیں۔ وہ مشعلیں بہت دور تلک روشن نظر آ رہی تھیں یہاں تک کہ سرنگ کے اگلے سروں پر اِن کی روشنی جھلملاتے نقطوں کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میرے حواس کو گہری رات کا ادراک ہوا لیکن وہ رات کا کون سا پہر تھا اس کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

کیا وقت ٹھہر گیا ہے یا اس کا پہیہ الٹا گھوم چکا ہے۔ یہ سرنگ ہے یا کوئی ٹائم مشین؟ میں تاریک ماضی کے کسی عہد پہنچ چکی ہوں یا مستقبل پیچھے رہ گیا ہے؟

اس تذبذب میں مجھ سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد کئی لوگ خاموشی سے چل رہے تھے جن کی شناخت اجنبی ہونے کے باوجود ان سے نامعلوم سی شناسائی محسوس ہو رہی تھی۔ اور میں ان سب لوگوں سے عدم واقفیت کے باوجود ایک

ورطہ حیرت میں مبتلا قدم سے قدم ملاتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ راستہ انجان ہو کر بھی شناسا سا لگ رہا تھا۔ وہ ہمراہی اجنبی ہو کر بھی ہم سفر تھے۔ جانے کسے کہاں آگے بڑھ جانا یا پیچھے رہ جانا تھا؟

ہر دو مشعلوں کے بیچ میں سرنگ کے دونوں جانب داخل ہونے یا باہر نکلنے کے لیے بلند دروازہ نما راستے موجود تھے۔ وہ در بھی مٹیالے رنگ کے تھے اور کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان دروازوں سے پہیلیوں کی مانند راستہ گھوم کر کہاں جاتا ہے سرنگ کی چھت نسبتاً بلندی پر اور متوازی تھی نیچے مٹی کی لیکن پختہ اور جمی ہوئی راہگزر بچھی تھی۔ اس طویل سرنگ میں کسی در سے کوئی شامل ہو رہا تھا یا بچھڑ رہا تھا اس بات سے قطعی لاعلم میری نظریں سامنے سرنگ کے آخری سرے پر جمی تھیں، جہاں حد نظر تک ٹمٹماتے جگنوؤں کی مانند روشن مشعلیں لامتناہی راہگزر کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ اس روشن اور مٹیالے راستے میں خشک مٹی کی مانوس سی مہک گھلی ہوئی تھی۔ جس کی کشش مجھے ہوا میں اڑتے زروں کی مانند رواں رکھے تھی۔

میں کون ہوں؟

کس عہد میں ہوں؟

اگر میں وہی ہوں جو خود کو پہچان پا رہی ہوں تو یہاں موجود سب لوگ موہوم شناخت کے حامل کیوں ہیں؟

میرے اردگرد مناظر تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے ہیں کہیں سب لوگ بچھڑ جاتے ہیں اور کہیں اچانک پھر سے کئی قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

یہ سرنگ کس بستی میں جا نکلے گی۔ ابھی کوئی در ایسا نہیں آیا جہاں محسوس ہو کہ اب مجھے باہر نکلنا ہے۔ ہاں تب تک مجھے اسی سفر میں رہنا ہے۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں۔ میرے کئی بہت پیارے چہرے جدا ہو چکے ہیں لیکن ان کے وجود کی خوشبو میرے اردگرد پاسبانوں کی مانند ہمرکاب ہے۔ ان

مناظر میں منجمد کئی لمحے اس طرح ساکت وساکن ہو چکے ہیں کہ سامنے موجود ہونے کے باوجود میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔ بالکل میری نظروں کے سامنے لیکن دوری کی خلیج اتنی گہری کہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہوں تو بھی چھو نہ سکوں۔ اور قریب اتنے کہ مشام جاں میں رگوں کے تانے بانے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اختیار اتنا کہ سوچ انھیں مقید کر دے اور دل کے اندر اٹھتی کوئی لہر انھیں بہا لے جائے مگر بے اختیاری اتنی کہ ایک لفظ ان کی سماعت تک نہیں پہنچا سکتی۔

اختیار اور بے اختیاری کی کشمکش ایسی ہے جیسے تنگ راہگزر میں کھائی کے ساتھ چلتا مسافر یا ایک تنے رسے پر چلتا مداری جو منزل تک پہنچ جائے گا یا کہیں بیچ راہ محض ورق گم گشتہ بن جائے گا۔

خود کلامی کے ایک طویل وقفے کے بعد بے خبری اور تجسس کے عالم میں میں نے ایک عورت سے کہ جس کے قدم گرد آلود تھے، اس کے وجود میں تپتی مٹی اور کیکر کے پھولوں کی مہک تھی، لیکن چہرہ غیر واضح تھا، سوال کیا!

تم کون ہو؟

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔ کبھی میری مٹی میں میری ایک شناخت تھی لیکن پھر میں اسے قائم نہ رکھ پائی۔ یا یوں سمجھو کہ تیاگ دی۔ جیسے کئی بستیوں میں عورتیں صدیوں سے ستی ہوتی آ رہی ہیں میں نے اپنی ذات، اپنی شناخت، زبان رسم و رواج سب اپنی منشا سے یا شاید ایک بے اختیاری میں تیاگ دیے۔

کیوں اور کس کے لیے تیاگ دیے؟

میں نے سوال کیا۔

میری مٹی میں نرمی محبت اور وفا کا خمیر تھا۔ مگر مزاج میں الھڑ پن تھا اور بے نیازی بھی۔ ایک دن یہ دونوں اطوار مد مقابل ہو گئے۔

دور دیس سے ہوا کے رتھ پر ایک سوار آیا تھا جس کا لباس سفید اور بے شکن تھا۔

اس کی قوم نے ہماری بستیاں تاراج کیں اور محلوں پر قبضے جما لیے۔ راجاؤں کے بنائے زندان کھولے گئے، قیدی آزاد ہوئے، کئی امراء پابند سلاسل کیے گئے اور کچھ مارے گئے۔ داسیوں کی کیا زندگی ہوتی ہے اور ہماری بستی میں عورت داسی ہی رہتی ہے۔ خواہ راج محل کی ہو یا کھیت کھلیانوں میں کام کرنے والی۔ لیکن اس اجنبی نے مجھے من کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا۔ محبت کی ریشمی ڈور ایسی بندھی کہ سانسوں کا بندھن تو ٹوٹے مگر ڈور نہ ٹوٹ پائے۔ اس کا دیس، قبیلہ، زبان اور دھرم سب اجنبی تھے۔ اور میں سفید کپاس کا پھول تھی جس کے ریشوں پر کوئی بھی رنگ ہو چوکھا چڑھ جاتا ہے۔ اس دور دیس سے آئے اجنبی نے میری ذات کو پریم کا ایسا رنگ چڑھا دیا کہ چاہ کر بھی کورا رنگ واپس نہ لاسکی۔ وہ واپس جانے لگا تو سمجھ نہ آئی کہ یہاں اس کے رنگ میں رنگی جوگ لوں یا اس کے ساتھ ہولوں۔ ساتھ ہولوں تو اپنی مٹی سے کیسے کٹوں۔ کیا پودا زمین سے جدا ہو کر جی سکتا ہے؟۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔اگر ساتھ نہیں چلتی تو کیا اس کے بغیر رہا جائے گا؟

کیا اس بدلی رنگت کو میری اپنی مٹی سہ پائے گی؟

بس تب سے اب تک اس سرنگ میں معلق ذرات کی مانند محو سفر ہوں کہ کبھی تو اس سوال کا جواب ملے گا یا پھر میرا وجود کسی نئے سانچے میں ڈھل جائے گا۔

سرنگ کے اندر ساکن ہوا میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی پھر جانے وہ عورت راستے میں مجھ سے آگے بڑھ گئی پیچھے رہ گئی یا کسی در سے باہر نکل گئی، کچھ علم نہ ہوا۔ مجھے لگا کہ میں اساطیری دور میں پہنچ چکی ہوں لیکن کچھ مزید سفر کے بعد میرا خیال پھر سے تبدیل ہو گیا۔ راستے میں کسی مقام پر مٹی میں گھلی مہک تیرگی میں فسوں تر ہو چکی تھی۔ ٹمٹماتی مشعلوں کی ضو افشانیاں آنکھوں کے آگے کئی دائرے بناتی چلی جا رہی تھیں، ایک اور دھیمی مہک مجھے اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل سیاہ اور چمکیلی تھی، جیسے لکڑی دہک کر کوئلہ ہو رہی ہو۔ پھٹے ہوئے پاؤں ننگے اور چپٹے تھے۔ اس کے ساتھ کئی بچے بڑے اور بوڑھے ہیولوں کی مانند چل رہے تھے اس کے جسم پر کاکاؤ،

کیچڑے اور غلامی کی دھول جمی تھی اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈلا تھا اور لب سِلے ہوئے تھے اور چہرے کے نقوش مدھم تھے۔ اس سے قبل کہ میں اس سے کوئی سوال جواب کرتی وہ بچھڑتی ہوئی بہت پیچھے رہ گئی۔ لیکن کاکاؤ کی خوشبو کئی بار مجھے اپنے بالکل قریب ہی محسوس ہوتی رہی۔

ایک طویل قامت اور سبک رفتار لڑکی میرے قریب پہنچ چکی تھی اس نے چست مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ مومی مشعلوں میں اس کا حسن دہک رہا تھا۔ لیکن وجود پر سخت محنت اور مسکان تلے تکان واضح تھی۔

روپ رون تے کرم کھان۔ میں نے بڑی حسین لڑکیوں کو شاپنگ مالز میں صابن، شیمپو، نوڈلز اور واش روم کلینزز کی پروموشن کرتے دیکھا ہے۔ پارکنگ کے ٹکٹ کاٹتے بسوں میں دھکے کھاتے، ریسپشنسٹ کے کاؤنٹر پر گھنٹوں کھڑی لڑکیاں۔ کیا حسن اتنا ارزاں ہوتا ہے یا چند سکے اتنے گراں مایہ؟ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ شاید یہ اپنی معصومیت بھری خوبصورتی میں کسی حسینہ عالم کو بھی شرما دے۔ لیکن ایک ویٹرس! میں نے تاسف سے سوچا۔

میری سوچ کا ادراک کرتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسنے لگی لگی ـــــ لوگ مجھے ایک خوب رو ویٹرس مگر ایک کمتر انسان سمجھتے ہیں۔ جو محض ریسٹورنٹ میں پڑی دیگر سجاوٹی اشیاء کی مانند ہی ہے لیکن سخت مشقت کی بھٹی میں جلتا جسم اور آزردہ روح ان سب کی نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے۔

اونچی ایڑھی کے سینڈل کی ٹک ٹک ـــــ مشاطہ کی انگلیاں ـــــ رنگ و بو کا سیل رواں ـــــ مزدور طوائف ـــــ قیمتی سینٹ کی خوشبوئیں جن کے عطر شوگر کین کی زمینوں سے کشید تھے ـــــ ان خوشبوؤں کی تہہ میں خون اور پسینے کی مہک بھی شامل تھی، لیکن سبھی بے چہرہ اور موہوم کسی چہرے کا عکس برانڈڈ خوشبو کی شیشی جیسا واضح نہ تھا۔

ہاں میں اسے کچھ کچھ پہچان پا رہی ہوں۔ میرے دائیں جانب چلنے والی شاید فریال ہے۔ وہی فریال جس نے انجینئرنگ کالج میں بہترین تعلیمی کارکردگی کا پچاس سالہ ریکارڈ توڑا تھا۔ ہر جونیئر لڑکی کی آئیڈیل فریال۔

متوسط گھرانے کی وہ لڑکی جس کی مٹی میں ذہانت، انتھک محنت اور اعلیٰ اقدار شامل تھیں۔لیکن خمیر وہی محبت سے گندھا جو ہر عورت کی فطرت میں ودیعت ہوا۔

ہاں یہ وہی ہے جو دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی چلی جارہی ہے۔

اس کے کالج میں پڑھنے والا کسی امیر گھرانے کا لڑکا اس کی چاہت میں گرفتار ہوا اور فریال محبت میں۔ پسند کی شادی کے بعد اسے گھر داری بچوں اور سسرال کے ساتھ اعلیٰ اقدار نبھاتے یہ بھول ہی گیا کہ کامیاب بزنس مین اور انجینئر کی بیوی خود بھی ایک انجینئر تھی۔

فریال بھی کسی دروازے سے جدا ہو چکی تھی۔ میرے قدم گرد آلود تھے اور مومی مشعلوں کی مدھم روشنیوں میں مقید کئی مناظر آنکھوں کے آگے نوحہ کناں تھے۔بستی سے دور جنگل بیلوں میں کچھ دیوانے دھونی رما کر جوگ لیے بیٹھے تھے۔فرزانوں نے ان دیوانوں کو دیس نکالا دے ڈالا تھا اور خود بستیوں، عورتوں اور زمینوں پر قابض ہوئے تھے۔ان سب کے عقب سے ہوکر روشنی کی نرم لہریں زمانوں کی مسافت کو طے کر رہی تھیں۔ مجھے بھی کسی در سے باہر نکل جانا ہے جانے باہر کیا ہوگا وہ بستی جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا یا کوئی اور زمان ومکاں مجھے گھیرے میں لے لیں گے۔

دن کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ راستوں پر صبح دم کی بارش کے آثار تھے سڑکیں، گلیاں اور عمارتیں سب بھیگی ہوئی تھیں۔

میرے قدموں پر دھول کے کوئی نشان نہیں تھے مگر جسم طویل مسافت کی تھکن کا شکار تھا۔

پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی یا شاید آنکھ لگ گئی کیونکہ میں پھر سے اسی سرنگ میں موجود تھی۔

میرے اردگرد کیکر، خشک مٹی، کاکاؤ اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ محنت کشوں کے پسینے کی بو کے بھبھکے تھے اور قحط زدہ زمینوں پر پہلی بارش کی مہک تھی۔

اونچی ایڑی کے سینڈل، پھٹے پاؤں، تھکی ماندی مگر حسین و جمیل لڑکیاں، سیاہ رات جیسی تاریک اور دودھ کی مانند اجلی صورتیں، دیوانے، فرزانے پھر سے اسی سرنگ میں کبھی میرے آگے اور کبھی مجھ سے پیچھے ہیولوں کی مانند محوسفر تھے۔ میں نے ایک ثانیے کے لیے باہر نکلنے والے در کو غور سے دیکھا۔

وہ راستہ کئی بل کھاتا گھوم کر اسی سرنگ میں دوبارہ شامل ہورہا تھا۔

گُلِ مصلوب

وہ ہمالیہ کی برفیلی وادیوں میں پھوٹنے والی خودرو نیلی پوپی جیسی لڑکی تھی جسے وقت کی ہوائیں خشک بارانی زمینوں میں لے گئیں۔ بارشیں برسیں تو برسیں اور نہ برسیں تو میگھ پر کس کا زور ہے؟

ٹرین رُک گئی تھی شاید انجن خراب ہوگیا تھا یا کسی دوسری ٹرین کو لائن دی جانی تھی۔ بوگی کی کھڑکی سے باہر جھانکتے دریائے جہلم کے قرب میں واقع اس چھوٹے سے جنکشن پر پیشین فروٹ کا پودا دیکھ کر مجھے وہی خوشگوار حیرت ہوئی جو ایک بار نیلی پوپی کو گملوں میں لگے دیکھ کر ہوئی تھی۔ سفر جہاں مسافر کو بدل کر رکھ دیتا ہے وہیں کئی بار مسافر بھی راستوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ جیسے وہ پیشن فروٹ کا پھل جو جانے کئی برسوں قبل کسی اجنبی مسافر کے ساتھ سفر کرتا اس جنکشن کے قریب کھا کر پھینکا گیا ہوگا اور اُس حسین ویرانے میں اپنی جڑیں گاڑ گیا۔ اس پہاڑی علاقے کی سرخ زرخیز مٹی نے بھی تو اسے پزیرائی بخشی ہوگی، اپنی عنایتوں سے سینچا ہوگا ورنہ برصغیر میں تو یہ درخت کمیاب ہی ہے جیسے گرم صحراؤں میں نیلا گل لالہ۔

میں پیشین فروٹ کے پودے پر نظریں جمائے اس کے خوب صورت کاسنی پھولوں کی تصویر لینے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اتنے میں اسی بلیو پوپی جیسی دلکش نقوش کی حامل سبز نیلی آنکھوں اور سنہری رنگت والی سات آٹھ سالہ لڑکی نے برتھ سے نیچے

اترتے ہوئے میری شال کے ساتھ رگڑ کھائی اور اپنے دودھیا موتیوں سے آراستہ سینڈل میرے کپڑوں پر رگڑتی دھپ سے نیچے اتری۔ اس کی ماں نے شرمساری سے معذرت اور اپنی بیٹی کو پچکارتے ہوئے اپنے قریب بلا لیا۔

سارے سفر کے دوران وہ لڑکی مجھے اور میرے شیر خوار بیٹے کو تنگ کرتی رہی تھی۔ ایک بار تو منے کو چھیننے کی کوشش میں تقریباً گرا بھی چکی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس لڑکی پر پیچ و تاب بھی کھا رہی تھی مگر وہ اتنی خوبصورت تھی کہ بے ساختہ ہی اس پر پیار بھی آ جاتا۔

نیلی.........ادھر آؤ اب آنٹی کو تنگ مت کرنا۔

مگر نیلی بضد تھی کہ اسے میرے بیٹے کے ساتھ ہی کھیلنا ہے۔

اس کی کھینچا تانی سے منا کسمسا کر اٹھا اور رونے لگا میں نے نیلی کو خفگی سے گھورا اور منے کا کمبل اسے اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اپنی گود میں لٹا کر تھپکنے لگی۔

سوری آپ کو برا تو نہیں لگا۔ سارا رستہ یہ آپ کے بیٹے کو لاڈ ہی لاڈ میں تنگ کرتی رہی ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو سکول میں اس کی ٹیچرز بھی بہت تنگ ہیں اس بات پر۔ اسے چھوٹے بچے بہت پسند ہیں اب یہ گریڈ تھری میں چلی گئی ہے مگر ابھی بھی نرسری کلاس میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ آپ کے بیٹے کو بھی اسی لیے اتنا پیار کر رہی ہے۔

اٹس اوکے .... معذرت کی کوئی بات نہیں۔ سب بچے ایسے ہی شرارتیں کرتے ہیں۔ ویسے بھی اس عمر کی لڑکیوں کو بہت شوق ہوتا ہے اپنے کسی چھوٹے بھائی یا بہن کو کھیلانے کا۔ میں نے اس کا شرمسار چہرہ دیکھتے ہوئے مروتاً کہا کہا۔

اس لڑکی کی آنکھوں میں نیلے سبز اور سرخی مائل بھورے رنگوں کے خطوط مل کر بہت خوبصورت امتزاج میں ڈھلے ہوئے تھے۔ کبھی وہ آنکھیں سبز رنگ کے کنچے جیسی لگتیں جن میں سے سرخی جھلک رہی ہو تو کبھی نیلگوں رنگت نمایاں ہو جاتی۔ مجھے وہ آنکھیں دیکھ کر ہمالیہ کی وادیوں میں کھلنے والے نیلے گل لالہ کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی ویسی

ہی تھی ضدی، خودسر اور خوب صورت۔

سکول میں استانیاں اس سے تنگ........ گھر میں اس کی پھپھو اور دادی تک عاجز ہیں اس سے۔ ہر وقت چھوٹے بچوں کے پیچھے لپکتی رہتی ہے کئی بار ان بچوں کو گرا کے ڈانٹ بھی سنتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟ کسی کی بات پر کان نہیں دھرتی۔ عجیب ضدی سی ہو گئی ہے۔اس کے چچا اسے پاگل خانہ کہتے ہیں۔

میں نے اس کی شرمساری دور کرنے کے لیے کہا کوئی بات نہیں جب اسکی اپنی بہن یا بھائی آ جائے گا، اس کا شوق پورا ہو جائے گا تو پھر ایسے نہیں کرے گی۔

وہ کھڑکی کے باہر کسی نامعلوم نکتے کو تکنے لگی پھر دھیرے سے گویا ہوئی!

ہاں شاید.....

مگر........

نیلی کے پاپا اسے بہت پیار کرتے ہیں۔

اس بات کا اندازہ تو مجھے بھی ہو چکا تھا چند گھنٹوں کے اس سفر میں کوئی چار بار اس کے شوہر کا فون آ چکا تھا۔ نیلی ٹھیک ہے .... نیلی کھیل رہی ہے......... نیلی برتھ پر سو گئی........ جیسے جوابات گویا وہ مسلسل اپنے شوہر کو نیلی کے بارے میں تازہ ترین معلومات کسی رپورٹر کی مانند بہم پہنچا رہی ہو۔

اس نے کاٹن کا ڈیزائنر سوٹ پہن رکھا تھا مگر ساتھ میچنگ دوپٹے کی بجائے ہاتھ سے کڑھی ہوئی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ باریک کروشیہ سے لیڑھی گئی چادر پر پانچ کناروں والے خوبصورت کاسنی پھول ساٹن ٹانکے میں کاڑھے گئے تھے ان پھولوں کے درمیان میں گول شیشہ بڑی نفاست اور مہارت سے ٹانک کر لگایا گیا تھا۔

آج کل ہاتھ کی کڑھائی تو نایاب ہو چکی۔ خاتون تو بڑی مہذب لگ رہی ہیں مگر ہیں کسی روایتی علاقے سے .... دل ہی دل میں اس کے لباس کو سراہتے ہوئے سوچا۔

منا سو گیا تھا اسے میں نے ہینڈ کاٹ میں لٹا دیا۔ نیلی بھی دوبارہ برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ بیشتر مرد ٹرین سے اتر کر باہر پلیٹ فارم اور پٹریوں کے بیچ گھوم رہے تھے۔ بوگی میں خاموشی پھیلنے لگی۔ دوسرے انجن کا انتظار طویل ہو چکا تھا۔ باہر گھنے درختوں میں شام کے سایے اتر رہے تھے۔ فضا میں جنگلی پھولوں، یوکلپٹس اور کُنیر کی ملی جلی مہک گھلی ہوئی تھی۔ فلک کے کناروں پر سرخ کیسری اور عنابی بادل چھوٹی بڑی ٹکریوں میں پھیلتے کئی دلفریب نمونوں میں ڈھلنے لگے۔

میں نے پرس سے اپنا فون نکالا اور کھڑکی سے باہر کے مناظر کی تصویریں لینے لگی۔ اسی دوران اس خاتون کا پھر فون آ گیا۔

نیلم کے والد بار بار فون کر کے پوچھ رہے ہیں کیا وہ آپ دونوں کو ریلوے اسٹیشن پر لینے آئیں گے؟ میں نے دریافت کیا۔

یہ سن کر نیلی کی ماں کے چہرے پر شام کے سایوں جیسی پھیلتی اداسی اتر آئی۔ پھر کہنے لگی نہیں وہ تو انگلینڈ ہوتے ہیں آٹھ سال سے نہیں آئے۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنی لگی اسی لیے تو نیلی کا بھائی نہیں آ سکا ابھی تک۔

میں نے جواباً فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس کے پاپا دور رہ کر بھی ہر وقت اسی کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ دیکھیں نیا فون بھیجا ہے۔ اس کے فوٹو روز منگواتے ہیں۔ اس نے شوہر کی صفائی دینے کی لاشعوری کوشش کی۔

مگر نیلی بہت ضدی ہوتی جا رہی ہے۔ اپنے چچاؤں کے ساتھ بالکل اٹیچ نہیں ہوتی نہ ہی کسی کے ساتھ کہیں باہر جاتی ہے۔ کہتی ہے اُن کی مانکی جیسی اسکن ہے اتنے بال کیوں ہیں؟ پاپا کیسے ہیں؟ میرے پاپا یہاں کیوں نہیں؟ مجھے اپنا بھائی چاہیے جیسے سب کزنز کے بھائی ہیں۔

آپ کے میاں اتنے عرصے سے واپس کیوں نہ آئے نہ ہی آپ دونوں کو بلوایا؟

میں نے استفسار کیا۔

امیگریشن کے مسائل ہیں نیشنیلٹی نہیں ملی ابھی تک۔ اگر ایک بار واپس آ گئے تو دوبارہ نہیں جا سکیں گے اور کوئی اندازہ نہیں کب تک کاغذات بنیں۔ بہت تڑپتے ہیں بیٹی کو گلے لگانے کے لیے۔

شام کے سایے گہرے ہونے لگے تھے ہوا کے ساتھ خنکی پھیل رہی تھی۔ میں نے شال اچھی طرح اوڑھ لی اور منے کو اپنی ملازمہ کے پاس چھوڑ کر ٹرین سے باہر نکل آئی۔ کئی گھنٹوں سے بیٹھے بیٹھے پاؤں سوجنے لگے تھے باہر پلیٹ فارم پر ذرا سی چہل قدمی من کو بہت بھائی۔ نئی زمینیں قدموں کو چھوئیں تو احساسات میں نیا اضافہ کرتی ہیں۔

اطراف سے جنگلی گھاس میں ڈھکی طویل بل کھاتی پٹریوں، پس منظر میں ابھرتے پہاڑوں اور پیشن فروٹ کے پودے کی کئی تصویریں کھینچ چکی تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ پودا اس ہرے بھرے علاقے میں بھی اداس ہے اگرچہ یہ کسی کنٹرولڈ انوائرمنٹ کی لیبارٹری نہیں نہ ہی کسی نرسری کے گملے میں اگایا گیا ہے مگر پھر بھی اس کے پھول گہری اداسی میں لپٹے محسوس ہو رہے تھے۔ دنیا میں اتنے بڑے بڑے سانحے ہوتے ہیں مگر میں جانے کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتی ہوں۔ آسٹریلیا میں ہر سال جنگلات میں آگ لگ جاتی ہے ہزاروں درخت جل جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں چیڑ دیودار کے قدرتی جنگلات تیزی سے سکڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی قیمتی لکڑی کے لاگ دریاؤں میں کس بے دردی سے بہا کر ٹمبر مارکیٹ میں پہنچا دیے جاتے ہیں اور میں برازیل کے ایک پودے کی اداسی اور تنہائی محسوس کر رہی ہوں، پھر خیالات جھٹک کر واپس پلٹی۔ شنید تھی کہ جلد دوسرا انجن ٹرین سے آن ملے گا۔ میں بوگی کے اندر واپس آ گئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اسکرول کرتے ہوئے ساری تصویریں دیکھنے لگی۔

آپ ان کاسنی پھولوں کی اتنی تصویریں کیوں بنا رہی تھیں؟ وہ پوچھنے لگی

میں ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ سے ہوں۔ ہر طرح کے پودوں سے دلچسپی ہے مگر کوئی

نایاب پودا نظر آ جائے تو اس کی تصاویر ضرور محفوظ کرتی ہوں۔

اچھا تو کیا یہ نایاب پھول ہے؟

نایاب تو نہیں مگر ہاں ہمارے ہاں کم ہی پایا جاتا ہے۔ گویا یہ اس پودے کا پردیس ہے۔

اچھا واقعی!

ہاں پیشن فروٹ برازیل کا پودا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیشن پھول پانچ زخموں کا پھول ہے۔ مصلوب کیے جانے کے زخم۔

جیسے چھوڑ کر جانے والے زخم دے جاتے ہیں .... انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں۔ اس نے اداسی سے کہا۔

اس کی چادر پر ٹانکے شیشوں سے ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنیں سرخ رنگ منعکس کر رہی تھیں اور اس کے چہرے پر کرب کے زرد سائے نمایاں ہو رہے تھے۔ اسی دوران دور پٹریوں پر بھاری انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔

آپ نیلی کا بہت خیال رکھا کریں ماں باپ دونوں کے حصے کی توجہ دیا کریں۔ اس کے چہرے کے خطوط بدلنے لگے شیشوں پہ پڑتی رہی شعائیں چپکے سے کھسکنے لگیں۔

جب کبھی انھیں کہنا چاہتی ہوں کہ پاکستان واپس آ جائیں تو سسرال میں شامت آ جاتی ہے۔ ساس کہتی ہے اس کے پاؤں تو جم لینے دو۔ اتنی ذمہ داریاں ہیں اس پر تمھیں احساس ہی نہیں کن مشکلوں سے انگلینڈ گیا تھا۔ جب میں کہتی ہوں کہ نیلی بہت ضد کرنے لگی ہے اس کے پاپا مل جائیں گے تو ٹھیک ہو جائے گی۔ اس پر نند کہتی ہے خود تجھے چڑھی ہے، نام نیلی کا لگاتی ہے۔

اس کے چہرے کے تاثرات میں غصہ، مایوسی، حسرت اور تلخی ایک ساتھ ابھر آئی کچھ دیر توقف کے بعد پھر کہنے لگی! اچھا آپ مجھے بتائیں شادی کے بعد میرے شوہر صرف ایک مہینہ پاس رہے تھے۔ کیا ایک مہینے میں ہمارے جیسی کسی عورت کو ازدواجی

زندگی کی سمجھ آ جاتی ہے یا میاں بیوی کے تعلق کی؟

میں نے تاسف سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا ایک مہینے میں تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتا۔

ہم دونوں کے لیے وہ فقط ایک آواز ہیں ...... نیٹ اور فون کا محتاج ایک رابطہ۔ شوہر کا ساتھ کیسا ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے کا احساس کیسا تھا یہ بھی یاد نہیں کہ ان کے ہاتھ نرم تھے یا سخت اور نیلی ...... اس نے تو کبھی باپ کو آنکھوں کے سامنے دیکھا ہی نہیں۔

ٹرین کو ایک جھٹکا لگا دوسرا انجن ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پرانے پلیٹ فارم اور پٹریوں کے ساتھ گھومتے مسافروں نے بوگیوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ شام کا ملگجا اندھیرے میں ڈھل رہا تھا۔ وسل کی گہری سیٹی بیلے میں گونجی۔

نیلی کی ضد اور مردوں سے چڑ کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں اسی وجہ سے اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑتی اور سب کے طعنے سنتی رہتی ہوں۔

دیکھیں آپ سسرال میں کسی سے مت کہیں کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سب باتیں آپ اپنے شوہر کو بتائیں اور انھیں قائل کریں کہ یا تو وہ پاکستان آ جائیں یا آپ کو اور نیلی کو اپنے پاس بلا لیں۔

اچھا اب میں نے سب کہہ دینا ہے۔ ساری باتیں ایک طرف مگر نیلی کو جو باتیں کی جاتی ہیں اسے سائیکو کہا جاتا ہے وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میری اتنی لاڈلی بیٹی ہے...... پیشن پھول کے زخم رِسنے لگے تھے۔

ہاں آپ کی بیٹی واقعی بہت پیاری ہے آپ کی طرح۔ وہ مسکرائی۔

ٹرین گھیر وگھیر کرتی اس چھوٹے سے اسٹیشن سے آگے بڑھی اور تیز رفتار پکڑ لی اندھیرا پھیل چکا تھا بوگی کے اندر مدھم سی بتیاں روشن ہوگئیں۔ تھوڑے سے مزید سفر کے بعد وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی اور نیلی کو برتھ سے اٹھا کر نیچے سیٹ پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ نیلی کا موڈ خراب تھا جانے سفر کی تکان تھی یا وہ پھر کسی بات پر اپنی ماں سے روٹھ بیٹھی تھی۔

ٹرین سست ہوتے ہوتے ایک جھٹکے سے رک گئی اس نے الوادعی ہاتھ ہلایا اور نیلی کو لیے گھنے درختوں گھرے ایک چھوٹے سے تاریک اسٹیشن پر اتر گئی اور پیچھے میں سوچتی رہ گئی کہ گملے میں لگے گلِ لالہ ہوں یا اجنبی زمینوں پر اُگے پیشن فروٹ کے پودے دیکھنے میں بہت خوب صورت لگتے ہیں مگر اندر سے اسی طرح اداس اور اکیلے ہو جاتے ہیں جیسے مصلوب ہجر لوگ۔ جن کی روح کے زخم اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔

کوئی چھ سال بعد کی بات ہے، میں ہسپتال کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھی آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ چند سیٹیں دور بیٹھی ایک خاتون کا چہرہ مجھے بہت مانوس لگ رہا تھا جیسے پہلے کہیں دیکھا ہو۔ اس کے ساتھ غالباً اس کا ادھیڑ عمر شوہر بھی تھا جس کے سر کے بیچ بڑا گنج نمایاں تھا۔ اپنے چہرے مہرے اور لباس سے وہ کسی دوسرے ملک سے آیا معلوم ہوتا تھا۔ خاتون کے چہرے اور سبز نیلگوں آنکھوں کی چمک ماند تھی، مجھے وہ برسوں کی مریضہ لگ رہی تھی۔ کافی دیر تک میں یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کہاں دیکھا ہے پھر اچانک کچھ یاد آنے پر فون میں فوٹوز کے فولڈر میں پرانی تصویریں تلاش کرنے لگی۔ پیشن فروٹ کے کاسنی پھولوں کی تصویروں کے بیچ ہاتھ سے کڑھائی کی ہوئی چادر اوڑھے ہوئے سبز آنکھوں والی ایک خوب صورت عورت کی تصویر سامنے آ گئی۔ ہاں یہ وہی ہے .... میں اس سے ملنا چاہتی تھی مگر اسی دوران ماہر نفسیات کے کمرے سے اس کا نام لے کر پکارا گیا اور وہ کسی معمول کی مانند چلتی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کاسنی رنگ کے پیشن فلاور سے سرخ لہو رسنے لگا ہو۔

◆◆◆

ایتھنے اور سموں

جولاہے بہت پریشان تھے، انھیں ڈر تھا کہ کہیں کمہاروں کی بیٹی کی طرح ان کی بیٹی بھی کسی آفت کا شکار نہ ہو جائے۔ مگر سموں جولاہن جس کا خمیر جانے کس مٹی کا بنا تھا کسی کی بات پر کان نہ دھرتی تھی۔ حسن ہمیشہ مغرور ہوتا ہے یا مغرور سمجھ لیا جاتا ہے پس ایسا ہی کچھ معاملہ سموں کے ساتھ بھی تھا۔ سموں کی انگلیوں میں فن تھا اور دستکاری اس کے رگ و ریشے میں پیوست تھی۔ پھر آرٹس کی اعلیٰ تعلیم نے اس کے ہنر کو گویا چار چاند لگا رکھے تھے۔ شاید اسی لیے اس کی بستی والوں کو ڈر تھا کہ کہیں کچے گھڑے کے ساتھ منجدھار کے بیچ ڈوب نہ جائے۔

سموں نے اپنے گرد کئی تانے بانے بنے ہوئے تھے جیسے کوکون اپنے گرد ریشم لپیٹ کر خود کو محفوظ رکھنے کی سعی کرتا ہے مگر یہی ریشم اس کی موت کا سبب بنتا ہے۔ بیچارہ یہ نہیں جانتا کہ اسی ریشم کے لیے پالا گیا ہے نہ کہ پروانہ بنانے کے لیے۔ تو سموں کا بھی یہی حال تھا اس کا فن، حسن، ذہانت اور فخر جہاں اس کی ہستی کو سنوارتے تھے وہیں کبھی بھی اس کو مٹانے کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ کون جانے کہ ریشم کی چاہ میں کب کوکون کو بھاپ کے سپرد کر دیا جائے۔

گوری چٹی سنہرے بالوں اور ہلکی بھوری آنکھوں والی سموں کے دماغ میں نجانے کیوں ایک عجیب سی سرکشی بھری تھی۔ اپنی ذات کا ادراک اس کا سب سے قیمتی زیور تھا۔

اس کی انگلیوں میں گویا سحر تھا اور اپنے من کو کپڑے اور کاغذ پر پینٹ کرنا آتا تھا۔ وہ جس کام کا ارادہ کر لیتی، اسے پایہ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتی تھی۔

بستی کے باہر کئی بنجارے اس کی راہ تکتے مگر وہ سب سے بے نیاز تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب اپنی اپنی راہ ہو لیتے کہ اس پتھر کی مورت سے سر پھوڑنے کا کیا فائدہ۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ ایک انجابی ڈور الگ سے اس کی روح کے تانے بانے کے بیچ میں اریب ڈال رہی ہے۔ بہت پرسکون نظر آنے کے باوجود اس کا دل چاہتا کہ اس ڈور کو کاٹ پھینکے اور آسانی سے سانس لے۔ مگر ہر طرف سے ڈوریوں میں جکڑی روح اپنے من میں اتنی شانت کیسے رہتی تھی اس بات کا بھید پانے کی آرزو دیوی دیوتاؤں کو بے چین کیے رکھتی۔ اس نے اپنا چرخہ چھوڑا تھا نہ ہی کھڈی۔ اس کے کاتنے، بننے، رنگنے اور سنوارنے کا ہنر اب دیسوں ملکوں سر چڑھ کر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

ایک دن پرانی دیویوں کو اس کے کاتنے سے سوت کی طرح جلن ہونے لگی۔ سموں کو ڈبونے کے لیے کوئی کچا گھڑا رکھنے کی کوشش کامیاب نہ ہو پائی تھی لہٰذا اس کو ارکنی کی طرح سبق سکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک دن ایتھنے بھیس بدلے سموں کی بستی میں آن موجود ہوئی۔ ریشمی لباس میں ملبوس اور ریشم کی تہوں میں لپیٹے کئی ہتھکنڈے ساتھ لیے ہوئے تھی۔ جولاہے گھبرا گئے کہ انھوں نے صدیوں دور دیس سے تاجروں کے بھیس میں آنے والے حملہ آوروں کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ ایتھنے کو امید تھی کہ سب سر جھکا کر ملیں گے مگر کم ذات جولاہے اتنی جلد سر جھکانے کے عادی نہ تھے۔ گئے وقتوں میں اسی جرم کی پاداش میں ان کے آبا واجداد کی انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں کیوں کہ نہ تو اپنا فن مفت بیچنے کو تیار تھے اور نہ ہی اپنا پیشہ تبدیل کرنے کے عادی۔ اب ان جولاہوں نے اس چرخے کو گھروں اور گیتوں کی زینت بنا کر سپننگ، ویوینگ اور سائزینگ کی دستکاریاں لگا لیں تھیں۔ جہاں کھیتوں کی چاندی کو ہنرمندی سے عمدہ معیار کے کپڑے میں بن کر سونا کمایا جا سکتا تھا۔

داؤ پیچ شروع ہوئے۔ سموں کے گرد مکڑی کے جالے بنے جانے لگے۔ کہیں ایکسپورٹ کا کوٹہ، کہیں ڈیوٹی، کہیں وسائل کی عدم دستیابی اور کبھی بجلی کی بندش۔ دھیرے دھیرے فن محدود ہوتا گیا اور روٹی روزی کے لالوں نے جولاہوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ ان حالات میں سموں کے فن کو سانس لینے کے لیے ہوا تک بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ ایک آرٹسٹ اپنا فن کب تک کاغذ کینویس اور رنگوں کی قیمت پر بیچتا ہے؟ اس لیے ایتھنے کو امید تھی کہ ایک دن سموں بلا مقابلہ ہی دستبردار ہو جائے گی۔

مگر ایسا نہیں تھا ایتھنے کو بالآخر سموں کے مقابل آنا ہی پڑا۔ وہ دیومالائی داستان کی دیوی تھی جس نے ان کہانیوں کے مطابق زیوس کے سر سے جنم لیا تھا، گویا وہ عقل ہی عقل تھی۔ تو دوسری جانب سموں سرتاپا حسن وفن سے سجی ایک زندہ حقیقت۔ ایتھنے کے اندر طاقت تھی ہنر تھا غرور تھا۔ اور دوسری جانب سموں کی رگ رگ میں صدیوں کا ہنر پرویا ہوا تھا، ہزاروں سال سے اس کی نانیاں دادیاں چرخہ لے کر بیٹھتیں تو کاتنے کے ساتھ ساتھ لمبی ہوک بھر کر ماہیے گاتیں، ان کے سینوں میں عشق کی تڑپ تھی ان کے پسینوں میں پہلی بارش کے بعد مٹی سے اٹھنے والی مہک تھی۔ ان کی آنکھوں میں جگنو چمکتے تھے اور چہرے پر روہی کی لہروں کا جال بچھا تھا۔ انھوں نے نسل در نسل اپنی اقدار کی حفاظت کی تھی۔ سموں ان کا مان تھی کیسے شکست تسلیم کر لیتی۔

دوسری جانب دیوی اپنے سب جال بچھائے منتظر تھی۔

سموں کہنے لگی کہ میں ارکنی نہیں ہوں کہ جس کے سامنے شکست خوردہ ہونے کی ذلت سے بچنے کے لیے تم نے اسے مکڑی بنا دیا تھا۔ تم ہماری بستی میں ایک دخیل کی مانند آئی ہو، اگر مہمان بن کر آتی تو ہم اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، مگر تمھارے ارادے نیک نہیں لگتے۔

ایتھنے نے بارعب مگر میٹھے لہجے میں جواب دیا: تم لوگ نہ جانے کس غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں تو تم لوگوں کی مدد کرنے آئی ہوں۔۔۔۔ کاتو، بنو، رنگو مگر میرے پاس

بیچو۔ میرا نام لگا کر چھاپ دو۔۔۔اچھے دام دلا دوں گی۔

سموں مسکراتے ہوئے بولی: یعنی تم تسلیم کرتی ہو کہ اب ہمارا فن تمھیں پیچھے چھوڑنے والا ہے مگر تم اپنی حاکمیت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو۔

ایتھنے نے جواب دیا تمھارے صدیوں پرانے فن میں میں نے نئی روح پھونکی ہے تم لوگوں کو زندگی کے جدید طریقوں سے روشناس کرایا ہے، مگر تم لوگ جاہل کے جاہل ہی رہنا میری تجویز میں تم لوگوں کا فائدہ ہے۔ جب پیٹ بھرا ہو تو ایسے افکار بھلے لگتے ہیں۔ خالی پیٹ تو چاند بھی روٹی ہی نظر آتا ہے۔

ٹھیک ہے کہ ہم نے تم لوگوں سے کئی ہنر سیکھے ہیں مگر یہ ہنر اتنے مہنگے نہیں تھے کہ ان کے خراج میں اپنے وجود گروی رکھ دیے جائیں۔

اگر ہم اپنا وجود گروی نہ رکھیں تو تم کیا کرو گی؟ کیا ہمیں بھی مکڑی بنا دو گی؟ نہیں اب ہرگز ایسا ممکن نہیں۔

اب تم خود پر سجا انسانی حقوق کا خول اتنی آسانی سے اتار کر پھینک نہیں سکتی۔ سموں کی اس بات کے جواب میں ایتھنے کے ہونٹوں پر زہر آلود مسکراہٹ ابھری، کہنے لگی دیکھ لو کتنی قومیں مجھے خراج ادا کرتی ہیں تم جیسی حقیر ہستی آخر کب تک میرے سامنے ڈٹی رہے گی۔

مگر سموں اپنے ارادے کی پکی تھی ہار ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ جانتی تھی کہ جدید دور میں جب دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے کوئی اس کی انگلیاں کاٹ کر نہیں لے جائے گا۔ اس کا فن، اس کا مان اور صدیوں کا ہنر اتنی آسانی سے خاک میں نہیں مل سکتا۔

ایتھنے لاجواب ہو کر خاموش ہو گئی مگر سموں کو لگا کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

قمری مہینے کی آخری راتیں تھیں چاند کو جانے کس پہر طلوع ہونا تھا؟ اندھیرا پھیل چکا تھا اور جھینگروں کی آوازیں رات کی گہرائی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

ٹمٹماتے تاروں نے آسمان کے آنچل پر پھیل پر اپنے رب کے بنائے نمونوں کو مزید روشن کر دیا تھا۔ اسی دوران ایتھنے کہیں اندھیرے میں گم ہو گئی اور سموں آنے والے وقت کی فکر میں غلطاں و پیچاں نیند کی وادیوں میں جا پہنچی۔

ہر صبح ایک نیا دن، نئی امید کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ اور اسی نئی امید کو لے کر جب سموں نے دن کا آغاز کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کی بستی کے سب گھروں سے چرخے غائب ہیں اور دستکاریوں سے راتوں رات کھڈیاں اکھاڑ لی گئی ہیں۔
اگرچہ کاتنے کے لیے ان سب کی انگلیاں تو سلامت تھیں مگر چرخے غائب تھے؟

سموں اپنی بستی کے بڑے بوڑھوں کے پاس پہنچی کہ دریافت کرے ماجرا کیا ہے؟

ایتھنے نے ان کی سب پرانی کھڈیاں خرید کر انھیں اپنی نئی ملوں میں کام دلا دیا تھا جہاں ان کو بہتر معاوضے کا لالچ دیا گیا تھا۔ اور مزید یہ کہ وہ کاروبار اور تجارت کے داؤ پیچ اور نفع نقصان کی فکر سے آزاد رہیں گے۔ بستی والوں کو کہا گیا تھا کہ اب ان کے مالی حالات سدھر جائیں گے قرض اتریں گے اور خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔

بستی سے باہر دور پرے دریا کنارے اپنی بستی کے سب چرخے جلتے دیکھ کر سموں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دھوئیں کے مرغولوں کے ساتھ پرانے وقتوں کی سوت کاتنے والی بڑھیا کے ماہیے نوحوں کی مانند فضا کو مغموم کیے ہوئے تھے۔ کتنی دیر تک وہ فضا میں بلند ہوتے شعلوں کو دیکھتی رہی پھر اچانک وہ تلخ مسکراہٹ سے ایتھنے کو دیکھنے لگی۔ چرخوں کی آگ بجھ نہیں رہی تھی اور ان سے بلند ہوتے شعلوں نے ایتھنے کے ریشمی لباس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

◆◆◆

لالہ

کیا مجھ سے ہاتھ ملاؤ گی؟

اس اچانک سوال سے میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ افریقی بچی اتنی کالی تو نہیں تھی مگر نمکین سی سلونی رنگت، چمکیلی آنکھیں، ہونٹوں پر مسکان لیے ہاتھ میری جانب بڑھائے ہوئے تھی۔

کیونکہ نہیں ـــــ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا۔

اور اندازہ لگانے لگی کہ یہ ابتدائی چاندراتوں میں گھلی سیاہی جیسی پیاری بچی چار سال کی ہے یا پانچ کی؟ اسی دوران اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ اُس کے بھورے رنگ کے گھنگریالے بالوں کو سختی سے کھینچ کر بہت سی پونیاں بنائی گئیں تھیں اور ماتھے سے ذرا اوپر سر پر ایک بڑا سا گومڑ نمایاں تھا۔ شاید اسی کے علاج کے لیے وہ ہسپتال میں موجود تھی۔

تمھارا نام کیا ہے؟

میں نے مصافحے کے بعد اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

لالاااا ـــــ اس نے جواب دیا۔

کیاااا ـــــ؟ لیلیٰ تو نہیں میں نے پھر پوچھا۔

نہیں نہیں ـــــ کِھر کِھر کِھر ررررر ـــــ اس نے باآواز بلند قہقہہ لگایا

پھر بولی لالااااالاہ ــــــ لالہ ــــــ

اچھا ــــــ میں نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا لالہ ــــــ اور فوراً ہی داغ لالہ کا خیال ذہن میں اُمڈ آیا۔

اس کا گومڑ غالباً پیدائشی تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ کچھ گھٹتا معلوم ہو رہا تھا کیوں کہ اس کے ارد گرد جلد سکڑنے کے واضح آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ گرمی کے موسم میں بھی اڑی رنگت والی سکرٹ کے اوپر فلیس کی شرٹ پہنے تھی۔ پاؤں میں میلے سے سلیپرز، جن میں سے ایک کے اوپر تتلی بنی ہوئی تھی دوسرے پاؤں کے سلیپر کی تتلی ٹوٹی ہوئی تھی۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

کِھر کِھر کِھر رررررر ــــــ وہ بار بار اپنے پیٹ کے بل پر عجیب سا زوردار قہقہہ لگاتی میرے دائیں بائیں پھدکنے لگی۔ اس ننھی بچی کے قہقہے میں کچھ ایسا تھا جو مجھے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس دن میری کلینک کی شفٹ شروع ہی ہوئی تھی اور اس وقت تک کسی مریض کی اپائنٹمنٹ بھی موجود نہیں تھی، اس لیے میری پوری دلچسپی اس بچی کے عجیب و غریب اطوار کی طرف مبذول تھی جسے میں نے پہلے بھی چند ایک بار پولی کلینک پر دیکھا تھا مگر اپنی مصروف روٹین میں کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اور اُس وقت سب کچھ چھوڑ کر، کمرے کا دروازہ نیم وا کیے میں کھڑی لالہ کو ہی دیکھ رہی تھی۔

مسلسل موبائل فون پر مصروف اس کی ماں اُس سے اِس قدر بے نیاز تھی کہ ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ اِس کی بیٹی کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

پانی پلاؤں؟ لالہ نے مجھ سے پوچھا! اور جواب کا انتظار کیے بغیر واٹر ڈسپنسر میں سے ٹھنڈا پانی گرانے لگی۔ کافی سارا پانی ویٹنگ لاؤنج کے فرش پر پھیل گیا۔ اس کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی گویا پانی لینا اور گرانا کوئی دلچسپ مشغلہ ہو۔

مجھے اس کی ماں کی لاپروائی پر غصہ آ رہا تھا۔

لالہ ـــــ ادھر آؤ

میں نے یہ سوچ کر آواز دی کہ پانی ضائع نہ کرے۔

اور وہ اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے، بھاگتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

میں نے اس کی کمر پر ہلکی سی تھپکی دی اور کہا گڈ گرل !!! ایسا مت کرو۔

مجھے اس کی شرارتوں سے قدرے الجھن ہونے لگی تو پوچھا تمھاری ماما کہاں ہیں؟

اس نے اپنی ماں کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا ـــــ اور پھر ِکھر ِکھر ِکھر رررررررر ـــــ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا جاؤ دیکھو تمھاری ماما بلا رہی ہوں گی۔

لالہ کی آنکھوں میں ایک افسردہ سا رنگ آ کر گزر گیا

پھر ضدی بچوں کی مانند سر نفی میں ہلاتے ہوئی کہنے لگی

وہ نہیں بلاتی مجھے ـــــ میں ادھر ہی کھیلوں گی ـــــ ِکھر ِکھر ِکھر رررررر۔

میں نے اُسے پچکار کر اس کی ماں کے پاس بھیجنے کی کافی کوشش کی مگر بے سود۔

کچھ ہی دیر میں اس کا باپ کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے آ گیا۔ اس نے جب لالہ کو واٹر ڈسپنسر سے ٹھنڈا پانی گرانے کے بعد اس میں چھپ چھپ کرتے دیکھا تو آواز دی۔

لالہ ـــــ لالہ ـــــ مگر لالہ نے جواباً صرف کھر کھر کرنے پر اکتفا کیا۔

اس کا باپ جو محض ایک تھکا ماندہ وجود نظر آ رہا تھا بیزاری سے خاموش بیٹھ گیا۔

اس کی ماں جو اپنے شوہر اور بیٹی کی بہ نسبت کافی بہتر حلیے میں تھی منہ دوسری طرف کیے پھر سے فون پر مصروف ہو چکی تھی۔ لالہ کبھی کلینک کے اندر موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگتی تو کبھی میرا گاؤن اور جوتے ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی۔

اسی اثنا میں ایک طویل قامت اور خوش شکل خاتون ویٹنگ روم میں داخل ہوئی، اس کے ساتھ تین بہت خوبصورت گول مٹول اور گورے چٹے بچے تھے۔ جن کی عمریں

چار سے سات سال کے درمیان تھیں۔ برانڈڈ کپڑوں میں ملبوس تینوں بچے ایسے خوش شکل تھے کہ دیکھتے ہی کسی کو بھی بے ساختہ ان پر پیار آ جاتا۔ میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور نسسٹر سے ان کی اپائنٹمنٹ چیک کرنے کا کہا۔

اسی دوران لالہ میرا طواف چھوڑ کر ان بچوں کی طرف لپکی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اب وہ میرا پیچھا چھوڑ کر ان بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے گی۔ اس کے چہرے پر بچوں کے لیے ایک اشتیاق تھا اور آنکھوں میں کھلنڈری سی شرارت تھی۔

لالہ بچوں کے قریب گئی اور اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا۔

جواباً ان بچوں کی ماں نے حقارت سے اس کا بازو بھینچ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

لالہ سن ہو کر دیوار کر ساتھ لگ گئی۔ اس کے ماں باپ پہلے ہی اس کی طرف سے لاپرواہ تھے، وہ یہ تماشا کیا دیکھتے۔

لالہ کی آنکھوں میں شرارت کی جگہ غصے، حقارت، نفرت اور محرومی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں اور وہ پتھر کی مورت بنی اپنی دھتکار کو سہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے تاثرات نے مجھے بھی منجمد کر دیا۔

اس پل مجھے ایسا لگا کہ لالہ کی چپل پر جڑی پلاسٹک کی اکلوتی تتلی بھی سفید برفیلی ٹھنڈک میں کملا گئی ہے اور ویٹنگ لاؤنج میں ہر طرف ہنسی اور قہقہوں کی جگہ ــــــ بے رنگ پتھر گڑ گئے ہیں۔

لالہ کے سر کے گومڑ کی طرف ایک افسردہ سی نظر ڈال کر میں نے سسٹر سے کہا۔

دروازہ بند کر دو۔

◆

آنکھوں کے راز اور خول

دو سیاہ آنکھوں نے مجھ پر ایک کہانی لکھنے کا دباؤ ڈالا ہے۔ میں ٹیب ہاتھ میں لیے لکھنے بیٹھی ہوں اور ان کالی سیاہ آنکھوں کی تحریر کے پیچھے خیالات کا ایک سیل رواں ہے کہ بند توڑ کر بہتا چلا آ رہا ہے۔ کئی بار کہانی خود کو لکھواتی ہے جیسے بارش خود بخود برسنے لگ جاتی ہے مگر کئی بار کہانی لکھنے سے قبل یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا لکھیں؟ ہمارے اردگرد ہر انسان ایک ماسٹر پیس کہانی ہے اور ہر چہرہ ایک شاہکار پینٹنگ۔ ہاں مگر چہرے صرف مصوری کے نمونے ہی نہیں بلکہ سبھی چہرے ایک راز ہیں اور آنکھیں وہ روزن جن سے کئی بار اندر کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ ہر انسان اپنے اوپر کئی خول چڑھائے پھرتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ان خولوں کو منافقت یا الگ الگ چہروں کے خول سمجھا جائے۔ بس کچھ ایسا ہر ذی روح کے اندر موجود ہے جو وہ پبلک نہیں کرنا چاہتا بلکہ شاید کسی کو بھی وہ سب دکھانا نہیں چاہتا۔

مصنف بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں لکھیں گے، نظریات کے خول میں چھپیں گے۔ علامتوں استعاروں میں ملفوف ہونے کی کوشش کریں گے۔ مگر کئی بار شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے اندرون کی ایک ہلکی سی درز کھول کر محض چند کرنوں کو باہر کی راہ دکھا دیتے ہیں۔

پھر بہت واہ واہ ہوتی ہے۔ ہاں یہ آپ سب کے ساتھ ہوا ہوگا کہ آپ کی توقع

کے برعکس کسی سادہ سی اور عام سی تحریر کو بڑی پزیرائی مل جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اپنے خول کے اندر جو سنبھالے بیٹھے ہیں کیا دیگر سب لوگوں کے اندر بھی کچھ ویسا ہی ہے؟ لوگ اس تحریر کو پسند کرتے ہیں جیسی وہ خود لکھنا چاہتے تھے مگر بوجوہ لکھ نہیں پاتے۔ جب کوئی اور وہی سب لکھ دیتا ہے تو کیسی طمانیت ملتی ہے۔ شاید وہ طمانیت اپنے اندر کا خول برقرار رہ جانے کی بھی ہوتی ہے۔ سننے اور پڑھنے والا کس طرح دل سے نکلی آواز اور تحریر کو پہچان جاتا ہے؟ پھر وہی سوال کیا کہ اتنے تنوع میں جہاں انگلیوں کی پوریں تک نہیں ملتی آنکھوں کے نمونے نہیں ملتے پھر بھی ہم سب کے اندر اگر کچھ مشترک سا ہے تو وہ کیا ہے؟

وہ بہت دلیر اور بڑے ادیب ہوتے ہیں یا بہت عام سے لوگ بھی جو اس اپنے اس فطری خول میں سے ایک کھڑکی کھول سکتے ہیں۔ اور اس کھڑکی سے نکل کر ہزاروں لوگوں کے دلوں میں نہاں خانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان عام سے لوگوں کی خاص سی آنکھیں وہ روزن ہیں جو من کے اندر چھپے راز آشکار کرتی ہیں اور محسوسات کی ترسیل بھی۔

میں ایک فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں کھانے کا آرڈر دینے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ اپنے قریب کھڑی ایک لڑکی جس کی عمر پندرہ سولہ سال ہوگی، کے چہرے نے مجھے کسی مقناطیس کی مانند اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اتنا سیاہ چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے تقریباً ہر افریقی نسل کے لوگ دیکھے ہیں۔ میانہ قد چپٹی ناک والوں سے لے کر طویل قامت اور قوی الجثہ سیاہ فام جن کی رنگت کے شیڈ براؤن کافی، کاکاؤ سے لے کر سیاہی مائل تک ہوتے ہیں۔ مگر اتنی چمکیلی سیاہ رنگت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کی جلد میں میلانن کے سب سے زیادہ پگمنٹ ہوں گے۔ مجھے کالے چہروں سے بے زاری نہیں ہوتی مگر مجھے یہ تسلیم کر لینے دیجیے کہ ایسا ہمیشہ سے نہ تھا۔ امی جی نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ کسی بھی چہرے

پر حقارت کی نگاہ نہیں کرتے، کسی کے چہرے کا تصور کر کے کبھی تھوکتے نہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بچوں کو ابتدائی آداب سکھائے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا امی جی کیوں بھلا؟

امی نے جواب دیا کہ اس لیے کہ ہر انسان کے چہرے پر رب کا ہاتھ پھرا ہوتا ہے۔

آخر دنیا میں اتنے زیادہ انسان ہیں ہر انسان کے چہرے پر اللہ تعالی اپنا ہاتھ کس طرح پھیر سکتا ہے؟

"ھوالذی یصور کم فی الارحام کیف یشاء"

جواباً امی یہ کہتیں۔ ہاں مجھے کبھی بھی انھوں نے اس آیت کی اردو نہیں بتائی تھی نہ میں نے پوچھی یہاں تک کہ خود ترجمہ پڑھا اور اس آیت کا مفہوم نظر سے گزرا۔

اس کے باوجود مجھے چہروں میں چھپے اسرار کی پوری سمجھ کبھی نہیں آئی۔ ایک بار کسی چھوٹی سی افریقی بچی نے مجھ سے پوچھا تھا "کیا مجھ سے ہاتھ ملاؤ گی؟" "ہاں کیوں نہیں" میں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور تب اس کے ہاتھ میں کالے چہروں کی محرومی کے ہزاروں بھید بھی تھے جو وہ چُپکے سے میری ہتھیلی کے ساتھ چپکے چھوڑ گئی تھی۔

ریسٹورنٹ میں ملی اس پندرہ سولہ سال کی لڑکی جس کی جلد چمکدار میلانن پر مشتمل تھی موٹے بھرے بھرے ہونٹ اداس آنکھیں جھکی پلکیں، اس عمر میں ہر لڑکی بہت حسین ہوتی ہے پس وہ بھی تھی مگر اس کی گہری اداس آنکھوں میں کوئی پیغام تھا۔ کوئی کوڈ ورڈ جسے ڈی کوڈ کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے وہ نک سک سی سجی ایک عورت کی خادمہ لگ رہی تھی جس کی بھنوؤں کو اکھاڑ کر نئی شیپ سے ہمکنار کرنے کی کوشش تیز رنگ کی آئی برو پینسل سے کی گئی تھی۔ گہرے آئی میک اپ کے باوجود وہ مادام کوئی بڑا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ مگر اس کم سن لڑکی کی سیاہ آنکھیں کوئی ایسا مقناطیس تھیں جو اپنی طرف

کھینچتا تو تھا لیکن ان میں کوئی نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

کچھ آنکھیں اور کچھ کہانیاں دنیا کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل ہی رہ جاتی ہیں۔ افغان مہاجر کیمپ میں شربت گل کی آنکھوں کے شرارے اگر کیمرے کی آنکھ نے محفوظ نہ کر لیے ہوتے تو عسرت خودی اور درد میں چھپے راز کیا دنیا تک پہنچ پاتے جو آج بھی راز ہی ہیں۔

درد اور دھتکارے جانے کا کرب کیسے کیسے شاہ پارے ترتیب دے جاتا ہے۔ اگر شربت گل مہاجر کیمپ میں سرخ رنگ کی پھٹی چادر کی بجائے کسی حکمران کے محل میں مراعات پا رہی ہوتی تو کیا اس کی آنکھوں میں وہ شرارے ہوتے؟

شربت گل کی طرح اس کالی سیاہ لڑکی کا چہرہ بھی ایک راز تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چاہے جانے کی ایک نظر محبت کی فریاد نظر آئی تھی کہ مجھے دیکھو! میرے چہرے پر بھی تو رب کا ہاتھ پھرا ہوا ہے۔

کسی احساس تلے اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا، آنکھیں چار ہوئیں تو میں نرمی اور محبت سے مسکرا دی۔ وہ حیران ہوئی پھر نظریں چرا گئی۔ اس کی جلد کے کالے کاغذ پر تشکر کی ایک اجلی تحریر ابھری مگر جب دوبارہ اس نے نظریں قصداً میری طرف کیں شاید وہ جواباً مسکرانا چاہتی تھی تو اس بار اُن آنکھوں میں ایک پریشانی سی تھی کہ کہیں اس کے اندر کا خول میرے سامنے ٹوٹ نہ گیا ہو۔

اس کے خول کا بھرم رکھتے ہوئے میں نے نظریں ہٹائیں اور آگے بڑھ کر کھانے کا آرڈر دینے لگی۔

◆

چیونٹیاں

رات کے کسی پہر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی جکڑ بندی سے آزاد ہوا ہو۔ پچھلے کچھ مہینوں سے ایسا کئی بار ہو چکا تھا مگر خواب اسے یاد نہ رہتا صبح اٹھ کر وہ معمول کے مطابق اپنے سب کام انجام دیتا۔ ایسا تو بہت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے ہر شخص زندگی میں کئی بار خواب میں ڈرتا ہے یہ ایک عام سی بات ہے اور یہ سوچ کر وہ اس عارضی کیفیت کو ذہن سے جھٹک دیتا۔

وہ آرمرڈ کور کا ایک بہت بہادر سپاہی تھا۔ اونچا لمبا مضبوط جسم کا مالک، کھلے کھلے ہاتھ پاؤں اور چوڑے چکلے سینے کے ساتھ وہ اپنے چہرے مہرے سے ہی پہچانا جاتا کہ فوجی جوان ہے۔

اپنی سروس کے دوران اس نے کئی اہم اور خطرناک سمجھے جانے والے محاذوں پر مہم جوئی میں حصہ لیا تھا۔ جہاں دل حلق میں دھڑکتا اور کلیجے مونہہ کو آتے ہیں اس کے قدم ان محاذوں پر بھی لڑکھڑا نہ سکے تھے۔ بہترین پیشہ ورانہ عسکری خدمات پر وہ بہت جلد ترقی پاتے پاتے صوبیدار بن گیا تھا۔

ڈسپلن صرف اس کی نوکری تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی بیوی کے خیال میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے ہر جگہ یہ ڈسپلن ان کی زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔

اس کی بیوی گاؤں کی رہنے والی تھی مگر چھاؤنی میں رہتے رہتے بہت جلد فوجی رانیوں کے سب طور طریقے سیکھ چکی تھی۔

ایک دن وہ یونٹ سے گھر واپس آیا تو باورچی خانے میں اپنے لیے خود ہی چائے بنانے لگا۔ چینی کا ڈبہ اٹھایا تو اندر بہت سی چیونٹیاں اپنی پسندیدہ خوراک سمیٹنے میں مشغول تھیں۔ اسے ایک جھٹکا لگا..........

پتر غلام حسین تو اتنی شیکر دوپہر کو اکیلا کیوں کھیلتا رہتا ہے۔ جلدی واپس آ۔ آج بڑی لُو چلی ہے مینوں لگدا اے آج ھنیری آئے گی۔

ابھی آیا بے بے..........

یہ کہہ کر اس نے برگد کے پیڑ سے چھلانگ لگائی۔ پیڑ کے نیچے چیونٹیاں اپنی کالونی کی منتقلی میں مشغول تھیں۔ لاکھوں کی تعداد میں کالی بھوری اور سرخی مائل چیونٹیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ بہت سی اپنے ساتھ باریک ریزوں جیسے سفید انڈے اٹھائے ہوئے تھیں۔ شاید زیر زمین سلگتی گرمی کے احساس سے گھبرا کر اپنی خندقوں سے باہر آ گئی تھیں، یا آنے والے طوفان سے وقت سے پہلے ہی باخبر ہو چکی تھیں اور اب اپنے انڈوں کے لیے محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

بے بے.......... بے بے..........وہ گھبرا کر چلایا۔

بے بے یہاں کیڑیوں کا بھوں ہے ....بے بے کئی کیڑیاں میرے پاؤں پر چڑھ رہی ہیں۔

دور افق پر کالا سیاہ جھکڑ نمودار ہو رہا تھا اور تب تک بے بے پین کر کے دھوپ میں ڈالی گندم سمیٹ کر دالان سے ہوتی ہوئی اندر کمرے میں جا چکی تھی۔

اور سینکڑوں کی تعداد میں چیونٹیاں اس کے جسم پر رینگ رہی تھیں۔

بے ے ے ے بے ے ے ے ے.......... اس نے ایک چیخ ماری..........

وہ اپنے گھر کے باورچی میں ہی موجود تھا۔ غصے سے چلایا!

زینت کتنی بار کہا باورچی خانے کی صفائی کا خاص دھیان رکھا کرو۔ مگر جانے کب تم اپنے اطوار بدلو گی؟

ارے کیا ہوا اتنا صاف ستھرا تو ہے۔ آپ بھی بلاوجہ ہی بگڑنے لگتے ہو۔ اس کی بیوی نے جواب دیا۔

تو یہ چیونٹیاں کہاں سے آئیں؟ تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ مجھے ان کیڑے مکوڑوں سے کتنی چڑ ہے۔ وہ بدستور خفا ہو رہا تھا۔

غلام حسین یہ تو بس چیونٹیاں ہیں۔ زینت نے جواب دیا۔

بس جو کہہ دیا وہی کیا کرو، مجھے گھر میں ایسا کچھ نظر نہ آئے۔ اس نے گویا بات ختم کی۔

کچھ دن بعد وہ اپنے یونٹ میں ٹارک رینچ ہاتھ میں تھامے ٹینک کے کل پرزوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ تیل کی پتلی لکیر کے پیچھے ایک بڑی کالی چیونٹی نمودار ہوئی۔ اسے دیکھنا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے بھاری بوٹ تلے چیونٹی کو مسل کر رکھ دیا۔

اوے پتر غلامے کیا ہوا چلا کیوں اٹھا ہے؟

ابا دیکھ اس کالے کاڈھے نے کتنی زور سے کاٹا۔

بڑی نسل کی کالی چیونٹی کا سر اس کے پاؤں پر گوشت کے اندر تک پیوست ہو چکا تھا۔ ابا نے بہت کوشش سے اسے الگ کرنا چاہا مگر وہ اپنی گرفت چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ زور لگا کر کھینچا تو اس کا تھورکس الگ ہو گیا مگر سر جلد میں پیوست ہی رہا۔

نامراد نہ ہو تو۔۔ کس برے سے کاٹا۔۔ ابا نے کھینچ کر چیونٹی کا سر ماس میں سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

اس کی جلد میں شدید جلن ہو رہی تھی۔

اسی دوران سی او اندر داخل ہوا جس کے ساتھ کچھ غیر ملکی انجینئر بھی تھے۔

صوبیدار اپنے سی او کو بریفنگ دینے لگا۔

سر جی اس ٹینک کا ایک ایک پرزہ ٹارک رینچ سے کس دیا ہے۔ ہر کام پرسین سے کیا گیا ہے نہ تو فورس کا ایک یونٹ زیادہ لگا نہ ہی کم۔

اینی ڈیفیکلٹی۔۔۔۔؟ سی او نے پوچھا

نو سر۔ اٹس پرفیکٹ سر۔

ویل ڈن۔ یہ کہہ کر سی او آگے بڑھ گیا۔

مری ہوئی چیونٹی تیل کی باریک لکیر کے پیچھے سے غائب تھی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اس کی ساتھی چیونٹیاں مری ہوئی چیونٹی کو گھسیٹتے ہوئے اپنی بل کی جانب رواں تھیں۔

بہت سی چیونٹیاں زرد پڑتی جنگلی گھاس میں رینگ رہی تھیں جہاں ایک زخمی سپاہی اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا تھا' اور مٹی اس کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔ کچھ چیونٹیاں خون اور جسم سے الگ ہو جانے والے حصے سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس نے زخمی سپاہی کو طبی امداد دے کر پیچھے روانہ کیا۔ اسی وقت کمپنی کمانڈر نے پیچھے سے آ کر غلام حسین کے کندھے پر تھپکی دی جو خاموش کھڑا چیونٹیوں کو تک رہا تھا۔

زینت سارا دن گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ وہ نہ صرف اپنے گھر کی بہت اچھی طرح صفائی ستھرائی کرتی بلکہ ہر کونا چمکا کر رکھ دیتی۔ اس کے علاوہ پورے گھر میں اکثر کیڑے مار دواؤں کا سپرے بھی کرتی اس کی کوشش ہوتی کہ گھر میں کوئی کیڑا پیدا نہ ہو۔ غلام حسین ایک اچھا شوہر تھا اور ماسوائے کیڑے مکوڑوں کے اس کے ساتھ کسی بات پر کبھی بگڑا بھی نہیں تھا۔

کرنل مظفر کی پوسٹنگ بہت عرصے بعد اس کینٹ میں ہوئی تھی۔ جب وہ میجر تھے تو غلام حسین ان کے ساتھ بطور اردلی کئی سال تک رہا۔ جتنی جانفشانی سے اس نے اپنے صاحب کی خدمت کی تھی اسے کرنل مظفر کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ ترقی پاتے ہوئے مختلف شہروں میں پوسٹ ہوتا رہا مگر کرنل کے خاندان سے اس کا رابطہ ہمیشہ برقرار رہا۔ کرنل کی والدہ ایک مشفق خاتون تھی۔ اور غلام

حسین کو ان سے ہمیشہ بہت شفقت ملتی رہی۔

جب وہ ملاقات کے لیے کرنل مظفر کے گھر پہنچا تو بی اماں ایک درخت کے نیچے مسور کی دال اور چینی کا آمیزہ ڈال رہی تھی۔

یہ دیکھتے ہی وہ پھر ماضی میں پہنچ گیا۔

اردلی میجر صاحب کے سویپر سے جھگڑ رہا تھا۔ یہ سراسر تمھاری کوتاہی ہے جو گھر میں اتنی چیونٹیاں آ گئی ہیں۔ اگر اچھے سے صفائی کرو تو گھر میں کوئی کیڑا نظر نہ آئے۔ بی اماں بیچ بچاؤ کرانے آئیں تو سویپر اس کی شکایت کرنے لگا۔ بی بی جی پتا نہیں یہ اردلی غلام حسین چیونٹیوں سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ جس دن کوئی چیونٹی نظر آ جائے خواہ مخواہ مجھ سے جھگڑتا ہے اور آج تو حد ہی ہو گئی ہے۔ اس نے جی کوٹھی کے پچھواڑے میں بانس کے اوپر مٹی کے تیل والے کپڑے کو آگ لگا کتنے ہی کاڈھے کیڑوں کو جلا دیا ہے۔

ہائے ہائے یہ تو نے کیا غضب کیا غلام حسین؟

ان بے زبانوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟ بی اماں ناراضی سے بولیں۔

بی اماں یہ نقصان دہ کیڑے ہیں اور بچوں والا گھر ہے اس لیے میں نے جلا دیئے۔ اس نے جواب دیا۔

ارے یہ تو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے بس اپنا رزق تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ان کو مارا نہیں کرتے۔

بی اماں سمجھا رہی تھیں۔

بلکہ جب بارش ہو تو ان کو صدقہ ڈالتے ہیں ان کے بلوں میں پانی آ جاتا ہے تو بے چین ہو کر باہر نکلتے ہیں۔

اور اس دن کئی برسوں بعد وہ اسی طرح بی اماں کو چیونٹیوں کو صدقہ ڈالتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں مجھے مظفر نے بتایا تھا کہ تو صوبیدار ہو گیا ہے۔ بڑا چنگا لگا مجھے تیرا ترقی پانا۔ اب کی بار آؤ گے تو اپنی گھر والی کو بھی ساتھ لانا۔

جان چھڑانے والے انداز میں جی اچھا کہہ کر وہ اندر کرنل صاحب سے ملنے چلا گیا۔صوبیدار بننے کے بعد وہ خود کو بھی ایک معتبر شخص سمجھنے لگا تھا۔

اسی رات وہ پھر خواب میں ڈرا۔ اگر چہ خواب اسے یاد نہیں رہا تھا مگر پسینے سے شرابور دھونکنی کی مانند چلتی سانسوں میں اس کی چھٹی حس ایک عجیب الارم بجارہی تھی۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ اس کے آبائی گاؤں میں گندم کی کٹائیاں شروع ہو چکی تھی اور ساتھ ہی مون سون ہواؤں کی وجہ سے طوفانی آندھیوں کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ مگر جس علاقے میں اس کی پوسٹنگ تھی وہاں گرمی کا موسم اتنی شدت سے نہیں آتا تھا۔ ابھی تک وہ لوگ کمروں میں بغیر پنکھا چلائے ہی سوتے تھے۔

پھر کچھ دنوں بعد اس نے ایک اور خوفناک خواب دیکھا۔

وہ ایک لق و دق وادی میں بھٹک رہا تھا، اس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی اور زبان پر کانٹے اگ آئے تھے۔ پیاس کی شدت اسے ایک کنوئیں تک لے گئی۔ اس نے کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے اپنا ڈول رسی سے لٹکا کر کنوئیں میں ڈالا۔

منڈیر کے ساتھ لاتعداد چیونٹیاں قطار در قطار رینگ رہی تھیں۔ منڈیر پر چڑھنے کے بعد وہ کنوئیں کی چرخی پر رینگنے لگیں۔ رینگتے رینگتے چیونٹیاں رسی تک پہنچ گئیں اور رسی کو کتر دیا۔

ڈول رسی سے آزاد ہو کر کنوئیں کی تہہ میں گرنے لگا۔ رسی چرخی پر لپٹی رہ گئی جس پر چیونٹیاں ہی چیونٹیاں تھیں۔ ڈول مسلسل نیچے جا رہا تھا اور کنوئیں کی پاتال کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ بھی کنوئیں کی تہہ میں مسلسل گرتا جا رہا ہو۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ خوف اور وحشت سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر پانی کا گلاس حلق میں انڈیل سکے۔

کچھ دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے کمرے کے اندر شدید گھٹن کا احساس ہوا وہ یونہی بلا مقصد گھر کے پچھواڑے میں ٹہلنے لگا۔

خواب میں رینگتی چیونٹیاں اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔۔اس رات پہلی بار اسے پورا خواب یاد رہا تھا۔۔۔۔۔۔خواب کی وحشت نے اسے پھر سے ماضی میں پہنچا دیا۔ جہاں وہ اپنے اسی خوف سے نفرت اور بیزاری سمجھ کر لڑتا رہا تھا۔

مٹی کے تیل میں تر کپڑا بانس کے اوپر بندھا تھا اور گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ادھ جلی مردہ چیونٹیاں، کچھ جلے ہوئے پر اور تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکا تو دوسرا آن موجود ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کے گھر میں کمروں کے اندر فرش اور دیواروں کے ساتھ کیڑے مار سپرے کے بعد مردہ چیونٹیاں ایک لکیر کی صورت میں جم گئی تھیں۔ زینت جھاڑو لگا کر انھیں وہاں سے صاف کر رہی تھی اور وہ دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔

اسی اثنا میں اس کے شیر خوار بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز اسے خیالوں سے واپس کھینچ لائی۔

اندر آیا، زینت پر نظر پڑی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، زینت کا وجود ٹھنڈا اور ساکت تھا۔ اس نے جلدی سے نبض ٹٹولی، آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ زینت ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو چکی تھی۔ اس کا بچہ بھوک سے بلک رہا تھا اور خود اس کے اپنے حلق میں کانٹے اُگے ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مرد رویا نہیں کرتے مگر اس وقت اس کا دل چاہا کہ اپنے منے کو ہاتھوں میں لیے وہ بھی بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے۔

اپنے خودساختہ خوف سے لڑتے لڑتے وہ بہت بری طرح ہار چکا تھا۔

◆

پرزم (Prism)

نفرت بھی وبائی امراض کی مانند پھیلتی ہے وجود میں داخل ہونے کے بعد اس کا انکوبیشن پیریڈ کتنے عرصے کا ہوگا یہ اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن کسی نہ کسی دن یہ بیماری ظاہر ضرور ہو جاتی ہے۔ یقیناً مجھے بھی اس ایئر بورن وبا کے جراثیم ہوا میں سے لگے تھے کیونکہ یہ نہ تو میری فطرت میں تھے اور نہ ہی مجھے گھٹی میں دیے گئے تھے۔ زبان، ذات، مذہب، قومیت رنگت ہم سب تعصّبات کے کتنے خانوں میں منقسم ہیں اور پھر بھی ہم انسان ایک ریس کہلاتے ہیں۔

امی نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں پیدا ہوئی تو بہت خوب صورت تھی گلابی رنگت تیکھے نقوش اور سنہرے ملائم بال تھے۔ کان میں اذان کے بعد امی کی سہیلی ایگنس نے جو سینٹ رافیل ہسپتال میں نرس تھی مجھے گود میں اٹھا کر ماں سے بڑے مان سے فرمائش کر ڈالی کہ تمھاری بیٹی کو گُڑتی میں دوں گی۔ امی کا دل بہت وسیع تھا جس میں محبت تو کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر نفرت اور تعصب کا کوئی خانہ نہیں تھا پھر وہ ایگنس کا دل کیسے توڑتیں۔ اس لیے مجھے گھٹی ایک پروٹیسٹنٹ کرسچین نے دی تھی۔ اس حوالے کی وجہ سے میرا اپنے متعلق بڑا مثبت خیال تھا کہ گھر میں شروع دن سے فراخ دلی پر مبنی ایسے ماحول کے بعد مجھے انسانوں سے نفرت کرنا یا تعصب برتنا کیسے آ سکتا ہے؟

لیکن بسا اوقات زندگی میں کچھ ایسے واقعات یا سانحات رونما ہوتے ہیں کہ

آپ کا خود اپنے متعلق لگایا اندازہ بھی فیل ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں اندازے لگانا اور درست رائے قائم کرنا تو اکثر ایک پہیلی بوجھنے جیسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی میرے کئی اندازے اپنے اور ناجیہ کے بارے میں بھی متضاد کیفیات کا شکار ہوتے رہے۔ ناجیہ کا داخلہ ہمارے سکول میں نویں کلاس میں ہوا تھا۔ اس کے والدین کچھ عرصہ قبل ہی ٹرانسفر ہو کر اس شہر میں آئے تھے۔ ناجیہ بھی میری طرح بہت شوخ اور زندہ دل لڑکی تھی اس لیے کلاس میں سب سے پہلے میری سہیلی بنی۔ ہم اکٹھی باسکٹ بال کھیلتیں اور شرارتیں کرتیں۔ وہ گانوں اور غزلوں کی پیروڈی بنا کر اپنی استانیوں کی نقل اتارتی تو سبھی لڑکیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ لیکن یہ سب زیادہ دیر تک جاری نہ رہا اور کچھ ہی عرصے بعد وہ نہ صرف مجھ سے بلکہ باقی لڑکیوں سے بھی کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔

ناجیہ گہرے سانولے رنگ کی لڑکی تھی اس کے والد اندرونِ سندھ سے سرکاری ملازم تھے۔ شاید اس کے آباؤ اجداد مچھیروں کی بستی سے رہے ہوں گے۔ اس کی جلد میں سمندر کی ملاحت گھلی تھی جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹوں کے کنارے اوپر اٹھ جاتے اور سیاہی مائل گلابی مسوڑھے نمایاں ہو جاتے۔ جن میں سفید دانت اس طرح جگمگاتے جیسے بدرنگ سیپ میں موتی جڑے ہوں۔ اس کے بال گہرے سیاہ اور ایسے چمکیلے تھے جیسے دریائی مچھلی کی جلد دھوپ میں چمکتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی سپیدی اور سیاہی دن اور رات کی مانند بہت نمایاں ہوتی۔

وہ سردیوں کا ایک کہر آلود دن تھا۔ میں جیومیٹری کے تھیورم حل کرتے اتنا پریشان نہیں ہوئی تھی جتنا ناجیہ کے سوالوں نے مجھے پریشان کیے رکھا۔ میری ہم جماعت سہیلیاں، ناجیہ اور میں پندرہ سال کی کھلنڈری لڑکیاں ہی تو تھیں۔ کیا ہمیں بھی کوئی وبا لگ سکتی تھی۔ اس عمر میں جسم اور ارادوں میں بڑی قوت مدافعت ہوتی ہے دل سادہ اور معصوم ہوتے ہیں پھر بھی ہم سب لڑکیاں باری باری کسی وبا کی زد میں آتی گئیں۔

ایک لڑکی اپنے بیگ میں چھپا کر رکھی پروین شاکر کی خوشبو میں سے کوئی نظم پڑھ رہی تھی۔

چیپ رومانس۔۔۔۔۔۔

سولولی۔۔۔۔۔

اف فف رومانٹک یار

نونو۔۔۔۔۔۔ پروین نیور ٹرسٹ آن بوائیز۔

نظم کے ساتھ اچھلتے فقروں میں کئی ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ شہناز کہنے لگی تم لڑکیاں پروین شاکر کا مذاق بنا رہی ہو کہیں خود مذاق نہ بن جانا۔ یہ سننا تھا کہ شہناز کے چھوٹے قد اور چوکور شیشوں والی نظر کی عینک کا مذاق بن گیا۔ خوب ہنسی کے فوارے چھوٹے۔ شہناز کے مستقبل کے حوالے سے اینیمیٹیڈ فلموں کے کرداروں جیسی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ بریک کے بعد کا فری پیریڈ بیت بازی کی بجائے طنز و مزاح کا روپ دھار چکا تھا۔

طنز اور مزاح کے بیچ ایک خفیف لکیر ہوتی ہے۔ ایک لائن آف کنٹرول جو کبھی کبھی انسان کو پل صراط پر بھی لا کھڑا کرتی ہے۔ مذاق سے نکلتی بات طنز بن شہناز کے دل پر لگی تھی۔ بظاہر خندہ پیشانی سے مذاق برداشت کرنے کے باوجود اس کی پلکوں کے نم کنارے مسلسل نظر انداز ہو رہے تھے۔ میری بیسوں سہیلیاں تھیں مگر شہناز کی میرے علاوہ کوئی اور سہیلی نہیں تھی۔ گرم لہو کے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو جاتا ہے۔ شہناز کے آنسو میرے غصے میں ڈھل گئے۔

دیکھو تم لوگ اس طرح کسی کی پرسنالٹی کا مذاق نہیں اڑا سکتیں۔ کیا ہوا اگر شہناز کا قد چھوٹا ہے یا وہ گلاسز پہنتی ہے۔ کیا اس کا دل نہیں ہے۔ کیا اس کے جذبات نہیں ہیں؟

ساری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔

سوری شہناز۔ ایک خفیف سی آواز ابھری کچھ دیر قبل کا کھلکھلاتا ماحول ایک دم

سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

پروین شاکر کی خوشبو بند کر کے واپس بیگ میں ڈالی جا چکی تھی۔

مجھے تھوڑا افسوس ہوا۔ کچھ شہناز کے آنسوؤں پر، کچھ ہنسی مذاق کے تلخی میں ڈھل جانے پر۔ کتنا مزہ آ رہا تھا گپ شپ کا بیت بازی کا۔ مذاق طنز میں ڈھل جائے، نفرت یا تعصب کا لبادہ اوڑھ لے تو انسان کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے۔ اس پل صراط پر وہ اکیلا نہیں چلتا نسلوں کی نسلیں چلتی ہیں۔ میں خاموش ہوئی تو ناجیہ میرے سامنے محشر بنی کھڑی تھی۔

بہت سکون تلا نا تمھیں آج ــــــ شہناز کی ہمدردی کر کے ــــــ نمبر بٹور کے؟

کون سے نمبر بٹور کے ناجیہ؟ یہ بھی تو دیکھو نا اس کے بھی کچھ احساسات ہیں۔

میں نے جارحانہ انداز میں جواب دیا۔

ہونہہ تم اور احساسات ــــــ؟ کیا تمھیں کسی کو ہرٹ کرتے ہوئے کبھی اس کی فیلینگز کا اندازہ ہوا؟

ناجیہ کے لہجے میں ناگن کی سی پھنکار تھی۔

ٹھیک ہے تم خوب صورت ہو گوری چٹی ہو اور بہت ذہین بھی ــــــ مگر ایک سوال کا جواب تو دو؟

کون سا سوال؟ میں نے حیرت سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے کہا۔

حسن کا معیار کیا ہے؟ ہاؤ ڈو یو ڈیفائین بیوٹی؟

ناجیہ نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

مجھے نہیں پتا ــــــ اس کے کڑے تیور دیکھ کر میں نے بیگانگی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

یاد ہے پچھلے سال تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ جب میں تمھارے ساتھ کسی لطیفے پر ہنس

رہی تھی۔ میرے مسوڑھوں سے اوپر اٹھے ہونٹ اور سانولی رنگت کے بیچ سفید دانت دیکھ کر تم نے کہا تھا ناجیہ مجھے ڈراؤ تو نہیں۔ ٹھیک ہے میں تمھاری نظر میں کالی اور بدشکل ٹھہری، کیا میرے احساسات نہیں تھے؟ کیا کسی کی مسکراہٹ اتنی بدصورت ہوسکتی ہے کہ چھین لی جائے؟ آج اپنی سہیلی کے چھوٹے قد کا مذاق بننے پر اتنا غصہ ہوئی، کیا مجھے کہے الفاظ بھول گئی ہو؟

آئی ایم سوری ناجیہ تم تو میری دوست ہو میں کبھی تمھیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی بس یہ الفاظ زبان سے پھسل گئے۔ میں نے شرمساری سے وضاحت دینے کی ناکام کوشش کی۔

دل میں کہیں چھپے تھے تو زبان سے پھسلے۔ یہ تم گوری رنگت والوں کے دل میں تعصب کی بیماری کہاں سے جڑ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ کیا خوبصورتی صرف جلد کی رنگت پر منحصر ہوتی ہے کہ انھیں اپنے علاوہ دنیا میں کوئی خوب صورت نظر نہیں آتا۔ میں جب آئینہ دیکھتی ہوں تو خود کو اچھی لگتی ہوں، میں اپنے بابا کو بہت پیاری لگتی ہوں آخر تم لوگوں کو کیوں نہیں لگتی ـــــ؟ اپنی شکل سے مجھے کوئی مسلہ نہیں تو کسی اور کو کیوں ہو؟ میرے گریڈز میری قابلیت میری اچیومنٹس زیادہ اہم ہیں میرے لیے۔

اور اس دن میں بہت دیر سوچتی رہی کہ کیا واقعی میری نیت اس کی شکل و رنگت کی ہنسی اڑانے کی تھی یا محض زبان کی پھسلن کسی کو اتنا آزردہ کرسکتی ہے۔ اگر زبان پھسلی تو کہیں لاشعور میں دبا کوئی متعصب احساس تو نہیں۔

ناجیہ تو میٹرک کے بعد جانے کہاں چلی گئی مگر اُس دن اس نے مجھے ایسے آئینہ خانے میں لا کھڑا کیا جہاں میں نے انسانوں کے عکس ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا شروع کیے۔ اس نے میری آنکھوں سے ایک پردہ، ایک جھلی بڑی بے دردی سے کھینچ کر الگ کی تھی جہاں ظاہری و باطنی تصویریں کسی پرزم سے گزر کر نئے ویولینتھ میں تقسیم ہو کر نظر آنے لگیں۔ جہاں ہر ایک رنگ منتشر ہو کر کئی رنگوں میں ڈھل جاتا ہے اور میں

اکثر کوئی کم تر صورت دیکھ کر خود سے سوال کرتی کہ آخر ـــــــ خوبصورتی کیا ہے؟ صرف ہمارے دیکھنے والی نظر، عدسوں کا فوکل لینتھ ؟ یا یا پھر ہم تک پہنچنے والی روشنی کی موجیں ہمیں یہ صورت کس طرح دکھاتی ہے؟ رئیل امیج ہیں کیا ـــــــ ؟

خوب صورتی بھی وقت کی مانند ایک ریلیٹیو ویلیو ہی تو ہے۔ جس کے پیمانے ہر عہد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر حقیقی خوب صورتی کیسی ہوگی؟

کئی برسوں بعد مجھے پتا چلا کہ کنساس سٹیٹ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد ناجیہ کی تقرری مقامی یونی ورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ہوئی ہے۔ کسی سیلف میڈ لڑکی کی اتنی ترقی یقیناً قابل ستائش تھی...... ایک دن اسے فون کر کے ملنے کا وقت طے کیا اور اس کے گھر پہنچ گئی...... مبارک باد دینے کے علاوہ بچپن کی سہیلی سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا۔ اُس نے انھی دنوں نیا نیا گھر شفٹ کیا تھا۔ تب تک کافی سارا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا اور کئی چیزوں کی مناسب سیٹنگ نہیں کی گئی تھی۔ وہ کچھ زیادہ نہیں بدلی تھی بس ڈھلتی عمر کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ مجھے لاونج میں بٹھا کر وہ کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد گھر کے اندرون سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پس منظر میں برتن ٹوٹنے کے چھناکے بھی شامل تھے۔ ایسے میں مجھے وہاں بیٹھنا بہت فضول لگ رہا تھا۔ وہ ڈرائینگ روم میں آئی تو میں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ وہ ہنسنے لگی اور کہا یہ سب دفع کرو تم کن باتوں میں پڑ گئی ہو۔ اپنے شوہر نامدار کو کچھ کھری کھری سنا رہی تھی، وہ ہے ہی اسی قابل۔

دیوار پر آویزاں تصویر میں ایک طویل قامت اور خوبرو شخص ناجیہ کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اپنی شکل سے وہ ناجیہ سے قدرے کم عمر لگ رہا تھا۔

میں نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ ہے تمھارا ہزبینڈ؟

ہاں یہ موصوف گریڈ سترہ کا ملازم ہے۔ لو میرج ہوئی تھی ہماری۔ کافی بینیفیٹ دلائے ہیں میں نے اسے اور اس کی فیملی کو۔

یہ کہہ کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

اس کی ہنسی کی کھنک میں ایک احساس تفاخر تھا یا سرخوشی تھی لیکن وہ کھوکھلا قہقہہ نہ تھا۔

پھر پوچھنے لگی تم کہیں جاب کرتی ہو؟ شادی کی؟

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

ایک پرائیویٹ ادارے کے آئی ٹی سیکشن میں جاب کرتی ہوں، شادی ہو ہی نہیں سکی۔

تمھاری شادی نہیں ہوسکی حیرت ہے مگر کیوں؟ اس نے بھنوئیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

ہمارے ہاں عموما والدین ہی اولاد کی شادی کرتے ہیں، جب تک انھیں کوئی مناسب بر ملتا معاشرے کی نظر میں میری عمر ڈھل چکی تھی سواب ایسے ہی گزر رہی ہے۔

مجھے لگا کہ میری مسکراہٹ میرا ساتھ نہیں دے پا رہی۔

یار آج کل کون پیرینٹس کے کیے رشتوں کی آس پر بیٹھا رہتا ہے۔ کہیں خود ٹرائی کرنا تھی نا! میری طرح۔

یہ کہہ کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اس کے ہونٹوں کے کنارے اسی طرح اوپر اٹھ گئے اور کالے مسوڑھوں کے بیچ سفید دانت نمایاں ہو گئے۔ دل ہی دل میں مجھے بہت سبکی کا احساس ہوا۔ ایسے لگا جیسے اس کے سب دانت الگ الگ شکلوں میں مجھ پر ہنس رہے ہوں مگر اس بار میں یہ بھی نہ کہہ پائی کہ ناجیہ مجھے ڈراؤ تو نہیں۔

◆

عیباں والیاں دے متھے لالڑیاں

شیش محل بھی شاہ جہاں نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں جب رات کے وقت مشعلیں روشن کی جاتیں تو ان کی آگ کے ہزار ہا عکس ان آئینوں سے پھوٹتے ہیروں کی مانند جگمگانے لگتے۔

شاہ جہاں جو ممتاز محل سے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر دنیا بھر کو تاج محل کا تحفہ بھی دے گیا۔

اس خوب صورت بلوریں محل میں بھی محبت نے اپنا فسوں کہیں نہ کہیں تو پھونکا ہوگا جو ہر آئینہ عکس گری کے جوہر دکھاتا نظر آتا ہے۔

مام پھر تو یہاں بڑا رومانوی منظر ہوتا ہوگا۔ ایک لڑکی نے کھکھلا کر کہا۔

اور باقی سب اسٹوڈنٹس بے ساختہ ہنسنے لگے۔ یہ شاہوں کا رومان ہے عام لوگوں کی ایسی عیاشی کہاں؟ ایک شوخ آواز ابھری۔

وہ سنجیدہ اور پروقار سی خاتون موٹے شیشوں کی عینک آنکھوں پر جما کر مسکرائی اور کہنے لگی

عورت کا دل بھی تو ایک شیش محل ہے جس میں نگینوں کی مانند ہزار ہا آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ہر آئینے میں اپنے سب پیاروں کے عکس الگ الگ سموئے رکھتی ہے۔

مانوس آواز سن کر میں کیمرا گلے میں لٹکاتے ہوئے تیزی سے اُس طرف مڑی۔

ممتاز۔۔۔۔۔۔ یہ تم ہو نا۔۔۔۔۔۔

میں حیرت میں گھلی سرخوشی سے پکاری۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر استفساریہ انداز میں کہنے لگی!

ہاں میں ممتاز ہوں مگر آپ کون ہیں؟

میں مہ جبیں۔ بھول گئی کیا؟ ہم دونوں لاہور کالج میں کلاس فیلوز تھیں۔

اووو۔۔۔۔۔۔ مہ جبیں۔۔۔۔۔

اور ہم دونوں یوں گلے ملیں جیسے بیس سال بعد اچانک ملنے والی سہیلیوں کو ملنا چاہیے تھا۔ جیسے تیز ہوا اور بدلیوں کا پانی برسنے سے قبل ملتا ہے جسے جلد ہی طے شدہ راستوں پر پھر سے بچھڑ جانا ہوتا ہے۔

ماہ جبیں تم کہاں غائب ہوگئی تھی گریجویشن کے بعد؟ مدتوں کے بعد ملی ہو۔

لڑکیاں تو پھل دار درختوں کا بور ہوتی ہیں۔ ہوا جانے کس کس دیس انھیں بکھیر دیتی ہے۔ پھر نصیبوں سے کوئی اپنا مل جائے تو کیسی خوشی ہوتی ہے۔

ہاں ایسے لگتا ہے جیسے نوعمری پھر سے لوٹ آئی ہو۔ درخت سے ٹوٹے پتے ہواؤں کے سنگ سفر کرتے گھوم کر اسی شجر کے نیچے آن گرے ہوں جہاں سے جدا ہوئے تھے۔

ہمارے چہرے دمک رہے تھے، اداس تھے، خوش تھے جیسے خزاں رتوں میں درختوں پر ایک ساتھ کئی رنگ اُمڈ آتے ہیں۔ ان کچی عمروں کے چڑھے رنگ بہت پکے ہوتے ہیں۔ ان رنگوں کے سنگ اپنے بچپن کی یادیں تھیں۔ یہ کالج لائف اب بچپنا ہی محسوس ہوتی ہے۔

ممتاز تم یہاں کیسے؟ میں نے پوچھا۔

اسٹڈی ٹور پر اپنے اسٹوڈنٹس کو لے کر آئی تھی۔

اچھا تو یہ ینگ سی بچی کون ہے پھر تمھارے ساتھ؟

میری بیٹی ہے۔

واؤ ماشاء اللہ شی از سو کیوٹ۔۔۔۔ میں نے اس کی پیاری سی بیٹی کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی اور بتانے لگی کہ ایک بیٹا اور دو بڑی بیٹیاں بھی ہیں۔

اچھا یہ بتاؤ تم کہاں ہوتی ہو کتنے بچے ہیں؟ کیا کرتی ہو آج کل؟

اس نے بیتابی سے سوال کیا۔

میں۔۔۔۔۔ میں کیا بتاؤں۔۔۔۔۔

ایک گہری خاموشی ہے سمندر کا سکوت ہے جو مدتوں سے میرے وجود پر چھایا ہوا ہے جس میں جانے کتنے سفینے غرقاب ہیں درد کی کتنی گہری کھائیاں ہیں۔۔۔۔۔

پھر ان سوچوں کو جھٹک کر کہا۔

میں۔۔۔۔۔ میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔

اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت پھر تاسف ابھرا۔

شاید میری بھی شادی ہوتی؟

اگر امی ابا زندہ رہتے؟

اگر ایسا ہوتا۔

اگر ویسا ہوتا۔

ہماری زندگی میں بے شمار ایسی باتیں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں جن کی کوئی توجیہہ پیش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت ساری باتیں بہت سارے فیصلے ہمارے اختیار سے چھین لیے جاتے ہیں یا ہم خود انھیں کہیں گنوا دیتے ہیں۔

پھر سوچوں کا سلسلہ ممتاز کی آواز سے منقطع ہوا۔

ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پوچھنے لگی آج کل کہاں ہوتی ہو؟

یہ فارنر کون ہے تمھارے ساتھ؟

بھائی کی گرل فرینڈ ہے۔

میں نے بھی جواباً مسکرانے کی کوشش کی۔

امی ابا کے گزرنے کے بعد اکیلی رہ گئی تھی بھائی نے اپنے پاس انگلینڈ ہی بلوالیا وہیں کی قومیت اختیار کر لی۔ اب اٹھارہ سال بعد پاکستان آئی ہوں۔ لاہور۔۔۔۔ اپنے شہر۔۔۔۔۔ اپنے وطن۔۔۔۔۔ مگر ویزہ لے کر۔

اس نے میرا ہاتھ تھپتھپایا اور کہنے لگی

تم ابھی بھی بہت پیاری ہو، تقریباً اسی طرح جیسے کالج میں تھی۔ کالج کی سب سے پیاری لڑکی۔

کوئی پرانا شناسا مل جائے جو ہمارے کسی بالا حصار میں مقید ہونے سے قبل کا ہو تو اشکوں پر بٹھائے ضبط کے سارے پہرے دار، ارادوں کے سارے سپاہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ فصیلیں دھڑا دھڑ منہدم ہوتی چلی جاتی ہیں۔

بیس برس بعد کوئی پرانا چہرہ نظر آیا تھا اردگرد سینکڑوں لوگ تھے جن کی متجسس نظریں میرے احساس پر بند باندھے کھڑی تھیں۔ میں کچھ کہنے سے عاری تھی مگر میرے ذہن کی وادیوں میں لفظوں کی باڑھ آئی ہوئی تھی اور آوازوں کا ہجوم تھا کہ باہر نکلنے کا راستہ مدتوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ ہاں میں جانتی ہوں سارے الفاظ کہہ کر تو بیان نہیں کیے جاتے۔ لیکن اس دنیا میں کئی لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو ہمارے دلوں کے اندر جھانک لیتے ہیں۔ خوب صورت قلعوں کے اندر بسی ویرانیاں دیکھ لیتے ہیں۔

اے کاروانِ زیست ٹھہر ذرا

یہاں بگولوں کا رقص مت کر

عورت کا دل تو محبتوں کا شیش محل ہے

وہ ہشت پہلوی عجائب خانہ

کہ جس کی دیواروں پر

بے شمار آئینے نگینوں کی مانند جڑے ہیں

ہر آئینے میں کوئی الگ عکس بستا ہے

کبھی یادوں کی مشعل روشن کرو

تو دیکھ پاؤ گے

ہر شکستہ آئینے میں

یاد کا صیقل عکس جھلملاتا ہے

اے کاروان زیست ٹھہر ذرا

اک سکوت!

کہ احترام لازم ہے

یہ عورت کا نہاں خانہ دل ہے

یہاں بگولوں کا رقص مت کر

مجھے لگ رہا تھا کہ ممتاز کے سامنے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے میں بار بار اپنے ذہن کو جھٹک کر ماضی سے موجود میں لانے کی شعوری کوشش کر رہی تھی۔

لیکن۔۔۔۔۔

جوگی صرف وہی تو نہیں ہوتے جو دھونی رمائے جنگلوں میں جا بسیرا کریں نہ ہی جوگنیں وہ جو اپنے ماس کے جوتے اور نینوں کے دیپ دان کرنے کو تیار بیٹھی ہوں۔ دنیاؤں کو تیاگ دینے والے شہروں میں بھی رہتے ہیں عام انسانوں کی طرح اور جوگنیں اچھے کپڑوں خوشبوؤں میں بسی بھی ہوتی ہیں مگر ان کا من قطرہ قطرہ پگھل کر یاد کے دِیوں میں جلتا رہتا ہے، تا کہ لب بام کچھ تو روشنی رہے۔

بھائی بھی تو اکیلا رہ گیا تھا۔ مرد بہت جلد ہر معاشرت میں خود کو ڈھال لیتے ہیں مگر میں نے خود کو اتنا ہی ڈھالا ہے کہ اب کسی کی گرل فرینڈ یا لو اِن ریلیشن پر حیرت

نہیں ہوتی مگر ایک لمحے کے لیے بھی خود ایسا کرنے کا نہیں سوچا۔

آج پھر سے امی اور ابا جی بڑی شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ کتنی جلدی تھی انھیں جانے کی اور میں یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ بھلا ماں باپ بھی یوں کبھی اولاد کو اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔ اپنا بچپن، سکول، اپنا شہر اس کی پرانی گلیاں بازار، لاہور کالج کی راہداریاں، جیل روڈ کی ٹریفک، لارنس گارڈن کی لائبریری میں پرانی کتابوں کی مہک، اردو بازار کے لگائے چکر، انارکلی کی چاٹ سموسے اور بخشی بازار کے جوتے، عید کی رونقیں اپنا پرانا گھر ان سب کی خوشبوئیں ممتاز کے ساتھ ہی آن وارد ہوئی تھیں۔ وہ لمحہ موجود سے ماضی کا دریچہ بنا تھا جس میں ان سب تک ان سب خوشبوؤں کے سنگ میں وقت کے دھارے میں الٹی بہتی چلی جا رہی تھی۔

لیکن اس دریچے کے دوسری طرف مجھے ممتاز کی بیٹی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر جہاں مجھے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا تھا وہیں اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا بھی گیا تھا۔ اور ایک پل کے لیے ایسا سناٹا چھایا جیسے کسی ٹورنیڈو کے مرکز میں سکوت ہوتا ہے اور چاروں طرف مہیب طوفان گھومنے لگتا ہے۔

مہ جبیں تم کتنی حسین ہوا کرتی تھی۔

ہاں بہت برسوں تک میں نے اپنا سراپا سینت سینت کر رکھنے کی کوشش کی تھی کوئی اور مشغلہ جو نہ تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کالج کے دنوں میں کتنے ہی لڑکے ایک جھلک کے دیوانے ہوا کرتے تھے۔ جانے کب وقت نے میرے اندر اک ناز دلربائی پیدا کر دیا تھا۔ لیکن فطرت کو اسے توڑنا مقصود تھا سو وہ ناز ٹوٹا اور ایسا ٹوٹا کہ مجھے میری ذات کے محور سے ہٹا گیا۔ محبت نے بڑی درشتی سے میرے وجود کی کشش ثقل ختم کی تھی اور مجھے خلاؤں میں معلق چھوڑ دیا تھا۔ یہ کشش ثقل تو ختم ہوئی سو ہوئی مگر پھر ایک گمان نے جنم لے لیا۔ کیا اسے بھی مجھ سے محبت ہے؟

اگر اسے مجھ سے محبت نہ ہوتی تو میں کیوں اتنی شدید تڑپ محسوس کرتی؟ لیکن اگر

اسے بھی محبت تھی تو اس نے مجھے چھوڑ کر اوروں سے کیوں دل لگا لیا؟ ایک بار اس نے کہا تھا کہ مل کر زندگی شروع کریں گے، ایسے ماہ و سال کا شمار کریں گے کہ میری زندگی کے ہر دن کا لازمی حصہ تم ہو گی، ہم ہو نگے۔

شاید میں اور وہ ہم بن سکتے دونوں ایک ساتھ رہتے ہر دن کو ایک نئے دن میں طلوع ہوتے اکٹھا دیکھتے مگر۔۔۔۔۔۔

مگر بہت سی باتوں کا کوئی اگر مگر نہیں ہوتا کوئی توجیہہ کوئی دلیل نہیں ملتی۔ محبتوں کے روٹھ جانے کی، رشتوں کے منہ موڑ لینے کی، وقت کی گرد میں دبیز چادر تلے چھپ جانے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

میں ممتاز کی حیرت اور ہمدردی بھری نظروں کا کیا جواب دوں اس نے میرے بہت اندر تک جھانک کر ہر ایک محرومی دیکھ لی تھی اور اب خاموشی سے بنچ پر میرے پاس بیٹھی تھی۔ شاید اس کے پاس بھی کوئی دلاسہ کوئی پرسہ نہیں تھا سوائے نرم مسکراہٹ یا ہمدردی سے لبریز نظروں کے۔

بھلا ان سب چیزوں کی دلیل ہوتی تو ممتاز جیسی یتیم اور معذور لڑکی کی شادی ملازمت سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جاتا۔ مجھے یاد آ رہا ہے میں کالج لائف میں کئی بار سوچا کرتی تھی کہ ممتاز کی شادی شاید ہی ہو پائے۔ مگر آج اس کی بیٹی کو دیکھ کر دل میں ایک ہوک اٹھی ہے۔ میرے اندر ماتا کے خشک سوتے کلبلاتے کیڑے بن گئے ہیں جو میری رگ رگ کو نوچ رہے ہیں۔ سارے درد، ساری تنہائیاں اس ایک کرب میں مدغم ہو گئے ہیں اور تنہائی کا جان لیوا احساس منجمد کئے جا رہا ہے۔ مجھے ممتاز پر رشک آ رہا ہے اور بار بار یہ احساس ستائے جا رہا ہے کہ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی تھی۔

عین عشق ماہی والی نہر وگے
کئی تریاں کرماں والڑیاں

ہک کوجھیاں دی لنگھ پار گئیاں
کھڑیاں روندیاں شکلاں والڑیاں
ہک سوہنیاں دے متھے بھاگ نئیں
باہروں لال تے اندروں کالڑیاں
غلام فرید اللہ کرم کرے
عیباں والیاں دے متھے لالڑیاں

لاہور فورٹ اور بادشاہی مسجد کی زیارت کے بعد ہوٹل واپس جاتے وقت ڈرائیور نے گاڑی میں ثریا ملتانیکر کی سی ڈی لگائی ہوئی تھی اور پورے ماحول کو اداسی کے فسوں جکڑتی خواجہ غلام فرید کی کافی مغنیہ کی پرسوز میں آواز گونج رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اپنی معذور سہیلی کی زندگی کے ساتھ اپنی زندگی کا موازنہ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑی شدومد سے جاری تھا۔

رات کی مسافر

میرے حلق میں تمبوں کی کڑواہٹ اتری ہوئی ہے۔ دیکھ پرچھائیں ـــــ میری حیاتی میں سَنھ لگا کر تو یہ کیوں چاہتی کہ میں تیری چاپلوسی کروں تجھے مکھن لگاؤں اور تو بھونگوں کی طرح میرے قدموں کی مٹی تلے کھڈیں نکال لے؟

دیکھ میں نے پہلے بھی تیری کسی ہم شکل کے سامنے اپنا من مارا تھا تو ہر بار بھیس بدل کے کیوں آ جاتی ہے۔ یا شاید میری نیہہ کی مٹی زیادہ کُولی ہے۔ پر اگر مٹی کُولی ہے تو یہ نامراد ''میں'' کیوں نہیں مرتی .... آخر کیوں نہیں .... ؟ کئی بار اسے سولی چڑھایا، بھانبڑوں میں راکھ کیا، دھول مٹی میں رول چھوڑا مگر یہ پھر بھی سانس لیتی ہے۔ اب مجھے لگتا ہے کہ یہ ''میں'' اتنی فالتو بھی نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں اس کا مان رکھ کر میں اپنا اور ـــــ شاید کسی اور کا بھی بھلا کر سکتی تھی ـــــ شاید ابھی بھی کر سکتی ہوں۔

میں نے اپنے من کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک طرف بڑی خیر تھی خیر ہی خیر .... نرمی نیکی بھلائی جو موتیوں جیسی سُچل تھی ...... مگر وہیں پاس ہی بند ڈھکن کے ایک مرتبان میں اتنا شر بھرا پڑا تھا جسے کسی دوسرے خناس کی ضرورت نہیں۔

دیکھ وہ ڈھکن پڑا رہنے دے ـــــ

اگر اسے اٹھائے گی تو نِرا فساد مچے گا، مجھے اس مرتبان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔

دریا کنارے ریت پر بیٹھی وہ عورت خود کلامی کے انداز میں مسلسل بڑبڑا رہی تھی

کہیں اس کے الفاظ بے ربط تھے تو کہیں مربوط۔ چودھویں کا چاند وادیوں صحراؤں اور مرغزاروں میں ہرسو اپنی نرم نیلگوں چاندنی بکھیرے ہوئے تھا۔ اسوج کی نیم خنک رات تھی اور خشک ٹہنیاں شوں شوں کرتی ہوا کے ساتھ نقارے بجارہی تھیں۔ دور کھیتوں سے گیڈروں کی مدھم آوازیں اور وقفے وقفے سے بھونکتے کتوں کی بھاری صدائیں ماحول پر وحشت طاری کیے ہوئے تھیں۔ پتن کے قریب ہی کچا گھڑا پڑا تھا۔ جانے کتنی مدتیں بیت چکی تھیں مگر یہ کچا گھڑا کسی نے نہ ہٹایا نہ بھٹی میں پکایا وہ چاندنی راتوں میں چمکتا اور اماوس کی گھور اندھیری راتوں میں ڈراؤنا ہو جاتا۔

کئی بار سنا ہے کہ چاندنی رات میں ذی شعور لوگوں پر بھی دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے تنکے کہرے کے ساتھ لپٹے انجانی منزلوں کے راہی بن جاتے ہیں۔ اور رات کی رانی کے مہکتے پودوں میں دومونہے سانپ بسیرا کر لیتے ہیں۔ میں نے اس کے بالمقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔

اندیشے اندھیرے اور وسوسے عفریت ہوتے ہیں لڑکی۔ اور خواہشیں وہ سنپولیے جنھیں چُلیاں بھر بھر دودھ پلاؤ تو بھی ڈستی ہی ہیں۔ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

•• کیا تم سوہنی ہو؟

•• نہیں

•• تو پھر کون ہو؟

•• وہ کمہارن جسے محبتوں نے ڈبویا، حسرتوں نے ڈسا اور انا نے زندہ رکھا ہے۔

بھلا کبھی محبتیں بھی ڈبوتی ہیں؟ میں نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ہاں یک طرفہ محبت کچے گھڑے اور بہتی لہروں پر بنے آشیانوں نے ایک نہ ایک ڈوبنا ہی ہوتا ہے۔

•• کمہارنیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں...... یونہی تو مہینوال اپنا دیس تیاگ کر

چناب کنارے بسیرا نہیں کر بیٹھا تھا۔

پتا نہیں ان کی مٹی میں کون سا فسوں ہوتا ہے کہ کئی حسن کوزہ گر زمانے بھر کی خاک چھانتے ایسی خاص مٹی کی تلاش میں گرد و غبار بن کر رہ گئے۔

شاید اس کمہارن کی بھی کوئی ایسی ہی داستان ہو گی۔

•• ہاں ....شاید ....

مگر شاہدہ کوئی جہاں زاد نہ تھی وہ تو کمہاروں کی معمولی بیٹی تھی اس کے آبا و اجداد نے چند پشتوں سے برتن بنانے کا کام چھوڑ کر کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ دس بیگھے زمین دو بھوریاں اور دو نیلی راوی نسل کی بھینسیں بھی تھیں، گھر میں کھلا رزق تھا اور کھیتوں کی مٹی میں خوش حالی بسی تھی۔ مگر محض اچھی صورت کسی کمہارن کی ہستی کو معمولی کے درجے سے اوپر تو نہیں اٹھا دیتی۔ مگر پھر بھی اس کے اندر کچھ تو خاص تھا۔ جب چار کوس دور دوسرے گاؤں کے ہائی سکول میں پڑھنے جاتی تھی تو اس کی گلابی رنگت صبیح چہرے اور ہلکی شربتی آنکھوں کے سامنے صبح کی کرنیں، سبز کھیت، بھرے کھلیان، کیا ربیع کیا خریف سبھی مانند پڑتے دکھائی دیتے۔ لاما قد، بھرا بھرا گداز جسم، گندم کی بالیوں جیسے چمکیلے بال، نرم اور ہر وقت گرم رہنے والی ہتھیلیاں اکثر پسینے سے بھری رہتیں اور سڈول کلائیاں کبھی چوڑیوں سے محروم نہ ہوتیں۔

وہ اتنی دلیر تھی کہ گاؤں کے بہت سے لڑکے بالے بھی ایسے دلیر نہ تھے سکول جاتے کھیتوں کے بیچ پگڈنڈیوں پر چلتے دو تین بار اڑنے والا ہرا کچور سانپ اور ایک بار سنگ چور بھی مار چکی تھی۔ کبھی کماد میں سے گزرتے جنگلی سؤروں کی آوازیں آتیں تو بھی اپنی راہ نہ بدلتی۔ سارے گاؤں میں ڈھاڈھی کے نام سے مشہور تھی۔ غصہ ناک پر دھرا رہتا۔ لیکن پھر بھی ایک مقام ایسا تھا جہاں اس کا سب غصہ کافور ہو کر حسرت و رنج میں ڈھل جاتا۔

اس کا بہت دل چاہتا کہ شہر میں رہے میٹرک کے بعد آگے کالج تک پڑھے جیسے

اس کے ماموں کے بیٹے بیٹیاں پڑھتے ہیں۔ ہمیشہ کپڑے استری لگا کر پہنے مگر گاؤں میں اکثر بجلی بند رہتی۔ پھر بھی ایک آدھ جوڑا استری کر کے تہہ لگا کر بکسے میں ضرور رکھا ہوتا...... اسے باقی گھر والوں کے برعکس ساگ کھانے سے چڑتھی اور مرغی کا بھنا گوشت پسند تھا۔

وہ جانے کب سے سے اپنے من کے صنم خانے میں ایک شہری بت کی مورت سجا کر اس کی پرستش کرنے لگی تھی۔ ایسا بت جس کا تن تو ماس کا تھا مگر من اس کے لیے محض ایک پتھر تھا۔ شاہدہ جو ہمیشہ سے دلیر تھی بغیر جھجکے اپنے دل کا حال اس ماموں زاد سے کہہ گئی۔ جانے کس آس میں مالٹے کی پھانک کی بجائے اس نے جنگلی تمبے کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا تھا۔ کمتر سمجھے گئے لوگوں کو یہ دنیا نہ محبت کا حق دیتی ہے نہ ہی پسندیدگی کا۔ اس نے شاہدہ کا وہ مذاق اڑایا کہ اس کے روئیں روئیں میں سدا کے لیے کڑواہٹ اتر گئی۔ معمولی کا لفظ کھرچ کھرچ کر روح پر لکھ دیا گیا۔

بے اختیاری میں محبت ناپسندیدہ شخصیت سے ہو جائے تو کیسی کڑی آزمائش ہے۔ اندر ہی اندر سیلی لکڑی کی مانند محبت سلگ سلگ کر عشق میں ڈھلی تو من کی اوکوں میں مشک بھرنے لگی۔ عشق کی مہک اس کے روئیں روئیں سے پھوٹی تو اس کی ماں کو بھی خبر ہوئی تب اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے بھائی بھاوج سے بیٹی کی خوشیوں کے لیے دامن پھیلائے گی۔ شاہدہ نے ماں کا ارادہ جان کر اسے سختی سے سوالی بننے سے منع کیا کیونکہ جواب کا ادراک بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مگر وہ اپنے آپ سے سوال کرتی آخر انسان آسمانوں سے وسیع محبتوں کو پیمانوں میں ڈال کر کیوں ماپتا ہے۔ مال وزر، ذات پات اور رتبے کے باٹوں میں کیوں تولتا ہے۔ اگر وہ شہر والوں کے مطابق واقعی معمولی ہے تو پھر اس کے اندر غیر معمولی ہونے کا احساس کیوں ہے؟ وہ کیوں اپنے اردگرد موجود دوسرے لوگوں سے مختلف سوچتی مختلف چاہتی ہے؟

اکثر اسے آدھے سر کا درد اٹھتا تو نڈھال ہو جاتی۔ ماں باپ کو فکر ہوتی آخر

سارے گاؤں سے زیادہ خوش شکل تھی تو کہیں اس کی موہنی صورت کو کسی کی نظر نہ لگ گئی ہو۔ کسی ویران راہگزر میں جن بھوت کا سایہ نہ پڑ گیا ہو۔ وہ ان کے اس خیال کو جھٹلاتے ہوئے کہتی، ''باشعور لڑکیوں کو جن بھوت نہیں چمٹتے بس سوچیں کھوکھلا کر دیتی ہیں۔'' کئی بار سر کے ساتھ کانوں میں بھی اتنا شدید درد اٹھتا کہ شدت درد سے دہری ہوئی جاتی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج جانے کا کوئی وسیلہ نہ بنا۔ تانگوں ریڑھوں کے پیچھے بھاگتے دھول اڑاتے گاؤں کے بچوں سے بیزار اس کی کوشش ہوتی کہ شہر اپنے ننھیال میں کسی دوسرے ماموں یا خالہ کے گھر وقت گزار آئے۔ اس قیام کے دوران دبے دبے طنز کے نشتر اس کی ذات پر برستے رہتے اور اس سنگ دل کی خصوصی تضحیک کا نشانہ الگ سے بنتی۔

پرانے وقتوں میں ہر چودھویں کے چاند کچھ لوگ دو موہنے سانپوں سے خود کو ڈسوایا کرتے تھے کیونکہ اس کے زہر میں انھیں ایک زود نشہ اور درد میں بے خودی کی عجیب لذت ملتی تھی۔ اِسی طرح وہ اپنی انا کو اُس شخص کی تضحیک سے بار بار مجروح ہوتے چپ چاپ دیکھتی۔ کہیں اس درد بھرے زہر میں کوئی نشاط تھا یا کوئی اور جاں فزا احساس؟ پھر اس کے بعد آدھے سر کے درد سے نڈھال سیلی چھال کی مانند سوں سوں سلگتی سرخ اور خشک آنکھیں ایک ہی منظر تکتی رہتیں۔

یہ انا بھی بڑی نامراد ہے رونے بھی نہیں دیتی وار بھی سہتی ہے ختم بھی نہیں ہوتی۔ اور یک طرفہ محبت اس بھی بڑھ کر تکلیف دہ، نہ یہ محبت جان چھوڑتی ہے نہ انا۔ میں کہاں جاؤں؟

دیکھ......مت روندو اسے کسی کے قدموں تلے۔ تم اتنی بھی معمولی نہیں۔

معمولی........اس لفظ سے تیز گھنٹیاں کان پھاڑنے لگتیں، ہاتھی چنگھاڑنے لگتے ہواؤں کا شور آندھیوں میں بدل جاتا۔

تم بے وقعت کیوں ہو؟ مت تضحیک کرواؤ اپنی یہاں شہر میں بیٹھ کر۔ جاؤ اپنوں میں لوٹ جاؤ ساگ روٹی کھاؤ۔ کھیتوں کے سبزے میں گھومو۔ یہ بے مراد محبت اس قابل نہیں کہ اس کی کی خاطر یوں رسوا ہوا جائے۔ وہ اکثر سوچتے ہوئے خود سے باتیں کرتی۔

ماموں زاد کی شادی اس کی کسی دوست سے طے ہو چکی تھی۔ تصویریں دیکھیں تو ایک نئی تلخی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ معمولی نقوش اور پھیکی رنگت مگر تھی ورکنگ لیڈی۔ اسے بہت حسد ہوا پھر یہ احساس شدت سے ابھرا کہ کوئی نقوش معمولی نہیں ہوتے۔ لیکن انسان کی قدر، اس کی محبت ہر عہد کے پیمانوں میں الگ طرز سے ماپی جاتی ہے۔ کاش وہ بھی کالج میں پڑھتی شہر میں رہتی۔ اپنے اس دور کے پیمانوں میں سے کسی پیمانے پر پوری اترتی۔

الجھے افکار اسے کسی بے آب و گیاہ دشت میں بھٹکاتے رہتے جہاں دریا کا کوئی کنارہ نہ ملتا۔ اگر کنارہ مل بھی جاتا تو دوسری جانب اس کا منتظر بھی تو کوئی نہیں تھا۔ بھلے کوئی منتظر نہ ہوتا مگر یوں معمولی ہونے کا طنز بھی تو نہ کرتا۔

شدید محبت اور شدید ناپسندیدگی کی دو انتہاؤں کے بیچ وہ ہچکولے کھاتی رہتی۔ کبھی کوشش کرتی کہ اپنے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے خود کو مہذب و برتر ثابت کرے اور کبھی سوچتی کہ وہ اپنی زندگی کو کس دھارے پر متعین کرے؟ شہر جہاں اس کی شدید خواہش کے باوجود زمین تنگ تھی یا وہ گاؤں جس کی نرم مٹی میں اس کے لیے محبت و پزیرائی تھی مگر اسے گاؤں کی اس لگی بندھی زندگی کی چاہت تھی نہ ہی گاؤں میں بسنے والے ان کئی گھبرو جوانوں کی پروا جو اس پر مرتے تھے۔

ماں باپ نے خوب دیکھ بھال کر ان میں سے ہی کسی گھبرو سے اس کی نسبت طے کر دی تھی۔ اس لڑکے کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہ ٹکتے مگر شاہدہ اس سے بے نیاز ہی رہی۔ ماں نے تنکا تنکا جوڑ کر اکلوتی بیٹی کا داج اکٹھا کیا تھا۔ وہ چشمِ تصور میں اپنی

گوری چٹی سرخ رنگت والی بیٹی کو دلھن بنی سب کی آنکھوں کو خیرہ کرتے دیکھتی۔ لیکن اسے باقی سب لڑکیوں کی طرح شادی گھر داری اور کھونٹے سے بندھی بے زار زندگی گزارنے سے الجھن ہوتی۔ وہ سوچتی کسی طرح سہی وہ بھی اپنی زندگی بدلنے پر قادر ہوتی۔

•• انسان کی شخصیت اور صورت سب کے سامنے عیاں ہوتی ہے لڑکی ......کوئی انسان کو خرید سکتا ہے بیچ سکتا ہے غلام بنا سکتا ہے، جنس بے مایہ سمجھ کر دھتکار سکتا ہے۔ مگر سوچوں اور خوابوں پر کسی کا اختیار نہیں خود خواب دیکھنے والوں کا بھی نہیں۔ نہ تو انھیں کوئی نوچ کر پھینک سکتا ہے نہ ہی ان کی تہہ تک پہنچ پاتا ہے۔

اس کے خواب اس کی سوچیں بھی ایک سربمہر راز تھیں جن تک کسی کی بھی رسائی نہ تھی۔ انھیں سوچوں سے اس کی رنگت کچھ زیادہ ہی سرخ ہونے لگی تھی سر کا درد بھی بار بار اٹھتا اور کانوں میں ڈھول بجنے لگتے۔ لوگ دیکھ کر کہتے شادی قریب ہے بہت روپ چڑھ رہا ہے رنگت کیسی سرخ وسفید نکھر رہی ہے۔

شدید سردی کا دن تھا۔ کہرے نے سبزے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کئی دن سے سر کے درد سے نڈھال تو تھی ہی مگر اُس دن آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی چھانے لگا۔ سرخ اور خشک آنکھیں جو کبھی نہ روئیں تھیں بند ہوتی جا رہی تھی۔ بھاوج نے تلوؤں کی زور زور سے مالش کی گھر میں دہائی پڑی تو اس کا بھائی جلدی سے ٹریکٹر ٹرالی لے آیا کہ اس میں ڈال کر شہر علاج کے لیے لے جائیں۔

شاہدہ نے اپنی بھاوج کو اشارے سے کہا کہ ٹرنک سے استری شدہ جوڑا نکال کر لے آئے۔ معمولی حلیے میں وہ ڈاکٹر سے دوا لینے بھی کبھی نہ گئی تھی۔ بھاوج نے نیا جوڑا پہنایا اور ٹرالی میں پرالی کے اوپر چادر بچھا کر اس پر لٹا دیا۔

جب ٹرالی دریا کے پل پر پہنچی تو اس معمولی لڑکی جسے ہمیشہ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوتا رہا، کی سانس اکھڑنے لگی۔ بھائی بھاوج گھبرا گئے ٹرالی روکی شور کم ہوا تو

اکھڑی سانسوں میں اس نے شادی سے انکار کر دیا۔

وہ کیوں مرے کیوں جان گنوائے؟ کیوں نہ وہ اپنی زندگی کو الگ طرز سے جی کر دیکھے اپنے لیے جئے اپنے لیے مرے، خود سے بھی محبت کر کے دیکھے۔ اور اس کا بھائی خاموشی سے مان گیا۔

وہ اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں بچوں کو پڑھانے لگی۔ ہمیشہ کپڑے استری لگا کر پہنتی، بال سلیقے سے بنا کر رکھتی کتابوں اور خوشبوؤں سے محبت کرتی رہی۔

مگر وقت کسی کا لحاظ نہیں کرتا حسین سے حسین صورتیں ہوں یا تخت و تاج سب مٹی میں ملا دیتا ہے پس اس کے صبیح چہرے پر بھی جھریوں کا جال بچھ گیا۔ تنا ہوا سر جھکنے لگا اور کمر خمیدہ ہونے لگی۔

اب بھی چاندنی راتوں میں وہ دریا کے پتن پر جاتی ہے جہاں مدتوں سے ایک کچا گھڑا دھرا ہے۔ مگر دوسری پار شہر سے کبھی بلاوا نہیں آیا نہ کچے گھڑے کے ساتھ وہ اپنی میں کی بازی لگانے موجوں میں اتری۔ ابھی بھی رات کی رانی کے پھولوں میں دومونہے سانپ سرسراتے ہیں ابھی بھی وہ محبت کے پرانے زخموں میں اترے زہر کی تلخی محسوس کرتی ہے۔

میں پتن کے قریب دم بخود بیٹھی اس کی کہانی سنتی رہی اسی دوران بادل گھر گھر آنے لگے اور اسوج کا چاند بدلیوں میں چھپ گیا..... دور کہیں بارش بھی ہوئی تھی جو دریا میں پانی کی سطح بڑھ رہی تھی...... ہر طرف گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا گیدڑ اور جھینگر بھی خاموش ہو گئے تھے...... میں نے گھڑے کی جانب دیکھا وہ وہیں پڑا تھا مگر اس کے قریب بیٹھی بوڑھی کمہارن اندھیرے میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ میں نے بھی خاموشی سے اپنا گھڑا وہیں دھرا اور دریا کی مخالف سمت کو چل دی۔

نوٹ: asterisks •• کا استعمال مکالموں کو الگ کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

لپ سٹک

گرمیوں کے طویل دن تھے اور لو ایسی چلتی کہ چمڑی بھی جھلس جائے۔ سکولوں کالجوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور بچوں کی موج مستیاں عروج پر۔ اچھل کود اور درختوں پر چڑھنا تو معمول کی بات تھی، صابرہ جو پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے، ایک تو لاڈلی کچھ زیادہ ہی تھی دوسرے حرکتیں بھی لڑکوں والی ہی اپنا لی تھیں، ایک دن درخت سے گری تو پاؤں میں گہری چوٹ لگ گئی، کوشش کی کہ اماں سے چھپا لے مگر کیا کرتی درد اتنا شدید تھا کہ ٹانگ بھی ہلائی نہ جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں پاؤں میں سرخی کے ساتھ سوجن بڑھ گئی، سب بھائی بھاگے اماں کو بلا لائے۔ ماں نے گود میں اٹھا کر بستر پر لٹایا اور ابا کو بلا بھیجا جب تک ابا آئے، صابرہ نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا، سب گھر والے الگ پریشان کہ اب کیا کریں ایک پڑوسی نے مشورہ دیا کہ شہر لے جا کر ڈاکٹر سے پلستر چڑھوا لو۔ صابرہ کی پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گی ہے۔ کسی دوسرے نے مشورہ دیا کہ نا بابا نا ایک تو اتنی گرمی اور لو، اب اگر پلستر چڑھوایا تو ماس گل جائے گا۔ آخر کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ صابرہ کے پاؤں کی ہڈی ساتھ والے گاؤں کے پہلوان سے چڑھائی جائے گی۔ ذرا شام ہوئی تو ابا صابرہ کو لے کر پہلوان کے پاس چلے گئے کہ ہڈی چڑھائی جا سکے۔ پہلوان کے آباؤاجداد پشتوں سے یہی کام کر رہے تھے سب کو پورا بھروسہ تھا کہ صابرہ آٹھ دس دن میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔ پہلوان

نے لال رنگ کا تیز چبھنے والا تیل لگا کر جب مالش کی اور کھینچ کر ہڈی کو برابر کیا تو صابرہ کی اتنی چیخیں نکلیں کہ وہ نڈھال ہوگئی۔ابا نے جلدی سے شربت کی بوتل منہ سے لگائی صابرہ کا دھیان بٹایا کہ پاؤں پر پٹیاں آرام سے لگ جائیں۔لکڑی کے فٹے اوپر نیچے رکھ کر صاف پٹیاں باندھ دی گئیں اور صابرہ کی تکلیف میں کچھ کمی ہوئی۔کوئی دس دن بعد پٹی کھلنی تھی۔صابرہ نے دس دن بستر پر ہی گزارے اور خوشی خوشی ابا کے ساتھ پٹی کھلوانے گئی۔پٹی تو کھل گئی مگر صابرہ نے جب پاؤں پر چلنا چاہا تو چال میں لنگ تھا۔پہلوان نے مالش کا تیل ساتھ دیا اور کہا کہ گرم نمک کی ٹکور اور اس تیل کی مالش سے چند دنوں میں لنگ جاتا رہے گا۔

اس کی ماں کہتی تھی کہ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ صابرہ کے مقدر میں لنگ کا دکھ لکھا تھا۔ہزار حیلے کرنے کے باوجود لنگ کم تو ہوگیا مگر ختم نہ ہوا۔اب گرمی، لو یا پہلوان کسی کو دوش دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا یہ سوچ کر صابرہ نے بھی صبر کرلیا۔اس چوٹ نے صابرہ کی زندگی ہی بدل دی، اگرچہ وہ اپنے ماں باپ کے علاوہ پانچوں بھائیوں کی آنکھ کا تارہ تھی مگر وہ شوخیاں باقی نہ رہیں تھیں۔کھیل کود تو اسی دن چھوٹ گیا تھا آٹھویں کے بعد سکول بھی چھوڑ دیا کیوں کہ گاؤں میں لڑکیوں کا سکول آٹھویں تک ہی تھا۔شہر جا کر پڑھنے کی ہمت اس لیے بھی نہ ہوئی کہ صابرہ کو کونسا پڑھ لکھ کر نوکری کرنا تھا۔بچپن میں ہی دور رشتے کے تایا کے گھر نسبت طے تھی۔تایا کا ایک ہی بیٹا تھا جسے تائی صرف دو سال کی عمر میں بلکتا چھوڑ کر چل بسی تھی۔تایا نے سوتیلی ماں کے ظلم کے ڈر سے دوسری شادی نہیں کی اور اپنی بھری جوانی بھی اکیلے گزار دی تھی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر صابرہ کے وہی خواب تھے، وہی امنگیں۔سکول چھوٹا تو فارغ وقت میں خواتین کے ڈائجسٹ پڑھ کر وقت گزارا کرتی اور کبھی سلائی کڑھائی، کھانا پکانا۔سلائی سے صابرہ کو بہت چڑ تھی صاف انکار کر دیتی، مگر کھانا بنانا سیکھانے سے ماں نے جان نہ چھوڑی۔ماں کہتی ارے بیٹی تو پرایا دھن ہے اگلے گھر بھی سدھارنا

ہے۔ نہ ساس، نہ نند، ارے تو تو بڑی قسمت والی ہے، آگے کوئی جھنجھٹ نہیں۔ مگر جاتے ہی گھر تجھ کو سنبھالنا ہے۔ وہاں کوئی تجھے سمجھانے والا نہیں ہے، جو سیکھنا ہے ابھی سیکھ۔
یہی بات اکثر صابرہ کی سہیلیاں بھی کرتیں اور اس کی قسمت پر رشک کرتیں کہ نہ ساس نہ نند۔ بس صابرہ ہوگی اور اس کا راج ہوگا۔

صابرہ کے تایا اور ہونے والے سسر غلام حسین زمینداره کرتے تھے۔ اور ملتان راجن پور میں آموں کے باغات تھے، کھیتوں میں تربوز اور خربوزے کی کی کاشت کرواتے، اللہ نے روزی میں خوب برکت دی تھی، کئی مزارعے تھے مگر ہر کام اپنی نگرانی میں کروانا ان کا شیوہ تھا۔ دوسری شادی نہیں کی تھی لہٰذا غلام حسین اور اس کے بیٹے احمد علی کی زندگی ڈیروں اور باغوں میں ہی بسر ہوئی تھی، مہینوں شہر کا رخ نہ کرتے۔ مگر عید شب برات اور دیگر تہوار لازماً اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہی گزارتے۔ اکثر رشتہ دار اب فیصل آباد شہر میں آن بسے تھے اور شہر کے ایک اچھے علاقے میں غلام حسین نے ایک کنال کا پلاٹ بھی لے رکھا تھا، بس انتظار اس بات کا تھا کہ کب بیٹا جوان ہو اور کب اس کے سر پر سہرا سجائے۔ بن ماں کے اولاد کی پرورش کوئی آسان نہیں ہوتی، اور پھر اپنی ہمسفر کی جدائی کا داغ بھی بھر گہرا تھا ان باتوں نے غلام حسین کے دل میں بردباری، نرمی اور رحم دلی کی صفات پیدا کر دی تھیں۔

اُدھر احمد علی نے بیس کا سن گزارا اِدھر غلام حسین نے شہر میں مکان کی تعمیر شروع کر دی، اپنی اکلوتی اور لاڈلی بہو کو وہ گاؤں میں نہیں بسانا چاہتا تھا۔ مکان تو بن گیا مگر عورت کے بغیر مکان کبھی گھر نہیں بنتا۔ اس لیے اب غلام حسین نے سمدھیوں کے گھر کی دہلیز پکڑ لی کہ تاریخ دیں، اب کے برس بیٹے کی برات لے کر ہی آئے گا۔

شادی کی تاریخ طے ہوئی، صابرہ کی ماں کی پیٹیاں اور ٹرنک کھل گئے۔ اس کے ابا نے پرانے شیشم کے درخت کٹوا کر فرنیچر بننے دیا تو ماں نے دو دو پیٹیاں رضائیوں بستروں سے بھر دیں۔

دوسری طرف کی تیاری بھی عروج پر تھی غلام حسین نے مردوں والے سب کام، گھر کی تزئین رنگ روغن کروا دیا تھا، مگر بری بنانے کے لیے سمجھ نہ آئی۔ اپنی سب سے چھوٹی بھاوج ثمینہ کو جو وہیں شہر میں ایک کالج میں ملازمت کرتی تھی بری کے لیے خریداری کا کہا۔ چھوٹی بھاوج نے بری کی تیاری شروع کی، درزیوں کو سوٹ سلنے گئے۔ جوتی کا ناپ منگوایا گیا اور آخر پر میک آپ کی خریداری کا مرحلہ آیا۔

دلھن کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے کون سا شیڈ جچے کا کوئی اندازہ نہیں تھا، بس جو رواج تھا سب خرید لیا گیا، پرفیوم نیل پالش، فیس پوڈر بلش ان کاجل مسکارہ۔ لپ سٹک خریدتے وقت ثمینہ کو سمجھ نہ آئی کہ کون سے شیڈ لے۔ تین لپ سٹک میڈ ورہ کی لے چکی تو جانے دل میں کیا آیا کہ دو ریولون کے شیڈ بھی لے لیے ساتھ ایک ٹیرا کوٹا اور ایک ریڈ رمل بھی۔

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب صابرہ بیاہ کر آ گئی، گھر میں خوشیوں کے شادیانے بجے، چراغاں ہوا شادی میں شریک ہر شخص خوش تھا۔ صابرہ کے دل میں ہزاروں امنگیں تھیں، شادی گھر اور صرف اس کا اپنا راج یہ خیال ہی اس کو سرشار کیے ہوئے تھا۔ جب مقلاوے سے واپس آئی تو سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر خود پر نظر ڈالی اور بیوٹی باکس کا پہلی بار دھیان سے جائزہ لینے لگی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی خوشی کا احساس پیدا ہوا۔ صابرہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہو۔ چاہے جانے اور سراہے جانے کی ایک فطری خواہش نے دل میں انگڑائی لی تھی۔ پہلی بار آئینہ اس سے گفتگو کرنے لگا اس کے ہونٹوں پر ادھ کھلی کلیوں جیسی مسکان کھلنے لگی جیسے اس کے ہاتھوں پر محض مہندی نہ رچی ہو بلکہ بہار کی آمد کا اعلان کرتی ہوئی مہک ہو۔

مگر دوسری جانب احمد علی کا موڈ شادی کے اگلے دن سے ہی سپاٹ سا تھا اور کسی نے خاطر خواہ دھیان نہیں دیا۔ جب اس نے میک اپ کیا اور ریڈ رمل کی لپ سٹک لگائی

تو نجانے کیوں احمد علی آگ بگولہ ہو گیا، کہنے لگا میں نے شادی کی رات کی بتا دیا تھا کہ مجھے یہ چونچلے نہیں پسند۔ صابرہ رسانیت سے بولی اچھا ابھی تو کوئی اور نہیں گھر میں آپ کے سوا، ابھی نئی نویلی دلھن ہوں یہ دیکھیں کتنی پیاری لپ سٹک ہے۔ میں کیسی لگ رہی ہوں؟ علی احمد نے دونوں شیڈ کی لپ سٹک اس کے ہاتھ سے چھینیں اور زور سے زمین پر پٹخ دیں۔ ایک لپ سٹک سٹور میں دور کہیں پیٹی کے نیچے گھسی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صابرہ کے دل کے ساتھ ساتھ پاؤں میں بھی شدید ٹیس اٹھی۔ علی احمد کی ناراضی کے پیچھے پہلی بار اپنے لنگ کا احساس اس شدت سے ہوا تھا کہ ہڈی چڑھواتے بھی اتنی تکلیف نہ ہوئی تھی۔ ریڈ رِل کی لپ سٹک فرش پر کتنی دیر گھومنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے ٹوٹی پڑی تھی۔

خود آگاہی کا لمحہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ تکلیف دہ لمحہ کبھی کبھی پتھر کو بھی پارس بنانے کا فن سکھا جاتا ہے مگر اس وقت صابرہ تو محض پتھر بنی سب دیکھ رہی تھی ایسا جمود طاری ہوا کہ گویا ہر سوال سے محروم ہو گئی ہو۔ مگر آگاہی کے اس لمحے میں یہ جان گئی تھی کہ شادی شدہ زندگی کیا ہے اور یہ ادراک بھی ہوا کہ اسے اپنے مسائل اسے خود حل کرنے ہیں، یہاں اس کے پانچ بھائی یا ماں باپ نہیں تھے جو اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گے۔ کہاں سسر کو بات بتانی ہے اور کہاں خاموش رہنا ہے، کون سا مسئلہ کیسے حل کرنا ہے؟ یہ سب ایک وجدان کی طرح اس پر اترے تھے مگر اس دن کے بعد سے اس کے ہونٹ ہمیشہ کے لیے لپ سٹک اور معصوم ہنسی سے محروم ہو گئے تھے۔

اگلے دن جب گھر کی صفائی کرنے لگی تو اس کے پسندیدہ رسالے اور ڈائجسٹ پلنگ کے نیچے پھٹے ہوئے اس کا منھ چڑا رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد غلام حسین بیٹے اور بہو کو چھوڑ کر راجن پور روانہ ہو گیا، علی احمد جانے کہاں نکل جاتا اور صابرہ گھر میں اکیلی پڑی رہتی۔ کیا پکانا ہے؟ کیا پہننا ہے؟ یہ سب اس نے شوہر پر چھوڑ دیا تھا جو مل جاتا صبر شکر کر کے لے لیتی۔ اکثر خاموش رہتی

اور اپنی ہستی کی گر ہیں کھولنے کی کوشش کرتی۔ غلام حسین نے ایک دم سے سارے گھر کی ذمہ داری بیٹے پر ڈال دی تھی اور خود دوبارہ سے زمینوں اور ڈیروں میں ہی بسیرا کر لیا تھا۔ اپنے بیٹے کو ذمہ داری اور گھر گھر ہستی سکھانے کا اس سے اچھا طریقہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ علی احمد نے شہر میں ہی اپنا کاروبار شروع کیا اور دو تین سالوں کی محنت سے اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو گیا۔

صابرہ کے ہاں پہلے بیٹی پیدا ہوئی اور اگلے ہی سال بیٹا۔ پھر ہر سال گھر میں یک نیا وجود آن موجود ہوتا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ اس کی زندگی پر ایک جمود طاری ہے اور وہ برف کی ایک مورتی کی طرح قطب شمالی کے کسی کونے میں پڑی دھوپ نکلنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کی چچی کہا کرتی تھی کہ شوہر سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تب بھی بچے تو آ ہی جاتے ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی آتے ہیں زن و شو کا تعلق ایک الگ چیز ہے اور دل میں جگہ بنا لینا الگ۔ اگر اس تعلق میں محبت و مودت کی چاشنی شامل ہو تو کیا ہی کہنے۔ اور اگر روکھا پن آ جائے تو یہ جمود طاری کر دیتا ہے۔ جھاڑن پکڑ کر گھر کی گرد صاف کرنا بہت آسان ہے مگر اپنے وجود پر جمی گرد جھاڑنا آسان مرحلہ نہیں ہوتا۔ لگاتار چار بیٹیوں کی پیدائش سے علی احمد کچھ دلگرفتہ ہوا تو وہیں غلام حسین بے حد خوش کہ اس کا آنگن چہکاروں سے بھر گیا تھا مدتوں تپتے صحراؤں میں سفر کرتے کرتے یہ گھر اسے گھنا سایہ دار شجر لگتا۔ صابرہ پر پے در پے اتنی ذمہ داریاں پڑی تھیں کہ دو دو سال میکے جانے کا وقت بھی نہ ملتا۔

وہ اپنے لنگ کی خامی سے واقف تھی اور اپنے اندر کوئی مزید کمزوری پیدا ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ چھ بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس نے اپنا وزن بڑھنے نہیں دیا تھا۔ میک آپ سے محرومی کے باوجود صاف شفاف رنگت، متناسب بدن کے ساتھ وہ اپنے لباس کا بھی خیال رکھتی، شوہر سے چھپا کر کہیں نہ کہیں سے میگزین اور ڈائجسٹ منگوا ہی لیتی، نت نیے فیشن کی اندھا دھند تقلید تو نہیں کرتی تھی مگر وقت اور رواج کے

مطابق کپڑے سلواتی۔ کچھ ان میگزینز سے سیکھتی تو کچھ لوگوں کو دیکھ کر۔انسان سکول کے نصاب سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا ایک انسان کو پڑھ کر سیکھتا ہے۔کوئی دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ صابرہ آٹھویں پاس اور گاؤں میں پلی بڑھی ہے۔ چھوٹی موٹی باتوں پر شوہر آگ بگولہ ہو جاتا اور وہ بہت سکون سے یہ سب دیکھتی مگر اپنے حواس پر طاری نہ کرتی۔سسر سے کبھی ان باتوں کی شکایت نہیں کی تھی۔ ایک اندرونی احساس اس کی رہنمائی کرتا کہ کب اپنے اختیارات استعمال کرنا ہیں اور کب چپ سادھنا بہتر رہے گا۔ کہاں شوہر کی ڈوریاں کھینچنی ہیں، کب، کہاں اور کتنی ڈھیل دینی ہے۔

علی احمد بھی آخر ایک مرد تھا اور مرد شاذ و نادر ہی ایک عورت پر مطمئن ہوتا ہے۔ اسی فطرت سے مجبور ہو کر اس نے کالونی میں نئے آ بسنے والے ایک گھرانے کی لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کی، یہ لوگ بطور کرایہ دار یہاں رہ رہے تھے اور قدرے آزاد خیال تھے۔صابرہ نے اسے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ کہا، خاموش تماشائی بنی سب دیکھتی رہی۔علی احمد سمجھتا کہ گاؤں کی بدھو عورت کو کیا پتا فون پر کس سے بات کر رہا ہے اور کس سے معاشقہ لڑ رہا ہے مگر اسے عورت کی حسیات کا درست طور پر اندازہ ہی نہیں تھا۔ تین مہینوں بعد جب غلام حسین گھر آیا تو بہو نے بہت طریقے سے ساری بات سسر کے گوش گزار کر دی۔ بہو کی پہلی شکایت تھی، اگرچہ غلام حسین کو اپنے بیٹے کے جارحانہ رویوں کا بخوبی علم تھا مگر اس سے قبل صابرہ نے شوہر کی کسی بھی بدسلوکی کا شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ چند مہینوں بعد ہی وہ لوگ اس کالونی کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے۔تب تک غلام حسین نے آموں کے باغات کا رخ نہ کیا۔

علی احمد کا کئی بار دل چاہتا کہ اس کی ازدواجی زندگی کا یہ جمود ختم ہو مگر کبھی بھی کھل کر صابرہ سے کہہ نہ پایا۔ صابرہ نے بھی گویا قسم اٹھا رکھی تھی کہ کسی تقریب پر بھی بناؤ سنگھار نہیں کرے گی۔ کئی بار وہ سوچتا کہ اپنے رویے میں پہلے ہی تبدیلی لے آتا تو اچھا تھا مگر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے میں انا آڑے آ جاتی۔

بہت ہی غیر محسوس طریقے سے صابرہ سب سے اہم ہستی بنتی چلی گی۔ غلام حسین کے باغات کی ساری آمدن اب صابرہ کے ہاتھ میں دھری جاتی۔ احمد علی کو اس نے کبھی اتنی ڈھیل نہیں دی تھی کہ باپ کی کمائی اڑاتا پھرے۔ صابرہ نے اپنی پانچوں بیٹیوں کو کبھی اپنی کمزوری نہیں سمجھا تھا بلکہ انھیں اپنی مضبوطی میں بدل دیا۔ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ وہ نئے دور کے تقاضوں سے کبھی بے بہرہ نہیں رہی اور خود کو اور اپنی بیٹیوں کو روایات کی پابندی کے باوجود وقت کے قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھایا۔ اولاد جوان ہو رہی تھی۔ بیٹا ماں کا فرمانبردار تھا تو بیٹیاں کسی بات سے انکار نہ کرتیں۔ صابرہ نے انھیں ذمہ داری کے ساتھ مناسب آزادی بھی دی تھی۔

صابرہ نے بڑی لڑکی کی نسبت طے کر دی تھی اور اُس عید پر ان کا سمدھیانہ اپنی بہو کی عیدی لے کر آیا۔ جس میں دیگر تحائف کے علاوہ اس کے داماد نے اپنی منگیتر کے لیے باڈی شاپ کی کاسمیٹکس کا بیگ بھی بھیجا تھا۔ علی احمد کسی کام سے اپنی بیٹی کے کمرے کی طرف گیا۔ وہاں وہ اپنے تحائف کھولے بیٹھی تھی۔ لپ اسٹک اور کلرنگز کے اتنے سارے شیڈز دیکھ کر وہ پھولی نہیں سما رہی تھی۔ چھوٹی بہنیں بھی باری باری سب شیڈ لگا کر آزما رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر کچھ عجیب اور کچھ مانوس سی مسرت رقصاں تھی۔ یہ دیکھ کر علی احمد چپ چاپ دروازے میں سے ہی لوٹ آیا۔

کتنے دن گزر گئے، علی احمد روزانہ سٹور میں جا کر اور کبھی اپنے کمرے میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے کچھ ڈھونڈتا رہتا تھا۔ ایک معصوم سی ہنسی، چھوٹی سی ایک خوشی کہیں نظر نہ آتی۔ اس کے کانوں میں جلترنگ سے بجتے اور کبھی بے ہنگم شور کان پھاڑنے لگتا۔

ایک دن پیچھے مڑ کر دیکھا تو صابرہ شگفتہ چہرے کے ساتھ لپ سٹک سے محروم ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بہت مبہم، بہت گہرا اور غیر محسوس سا تبسم تھا۔

ہلدی بیچاری کیا کرے

چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلاؤں گی
میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی چادر بچھاؤں گی
چادر کا پلو پھٹ گیا
درزی کو بلاؤں گی
درزی کی سوئی ٹوٹ گئی
گھوڑا دوڑاؤں گی
گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی
ہلدی لگاؤں گی

میں اور فضہ ہتھیلیوں پر کبھی سیدھی کبھی الٹی کبھی اوپر کبھی نیچے تالی بجا بجا کر کھیل رہی تھیں۔ لنچ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا اور میرا تو روز کا معمول تھا کھیلنے کودنے میں ہاف بریک گزر جاتی پھر بیتابی سے چھٹی کی گھنٹی کا انتظار رہتا۔

میں نے کبھی لنچ کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا اور فضہ لے کر ہی نہیں آتی تھی۔عموماً نہ تو اس کے پاس لنچ ہوتا اور نہ ہی پیسے۔ ہماری دوسری سہیلیاں البتہ اپنا لنچ ضرور ختم کرتیں۔تنگ آ کر امی کہتیں کہ کچھ بھی کھا لینا جو اسکول کی کینٹین سے مل جائے مگر بھوکی مت رہا کرو۔فضہ کا معاملہ مختلف تھا، فضہ قدرے صحت مند، صاف گندمی

رنگت والی، بھولی صورت اور گو پلو سی بچی تھی اور میں بالکل دبلی سی۔ اسکول میں میری فضہ کے علاوہ کسی سے خاص دوستی نہیں تھی۔ ہماری کلاس کی لڑکیاں اتنی لمبی لمبی اور تیز طرار نظر آتی تھیں کہ مجھے لگتا یہ عمر میں بھی مجھ سے کافی بڑی ہیں۔ اس لیے میں بلا وجہ ہی ان سے خار کھاتی اور اگر کسی نے میری صحت کا مذاق اڑایا تو سمجھو دوستی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ فضہ گم سم، کم گو، ہر بات ماننے والی اور کبھی نہ جھگڑنے والی لڑکی تھی۔

تیسری کلاس میں ہم دونوں ہی پکی سہیلیاں تھیں۔ میتھ کے سوالوں سے لے کر ٹیسٹ تک میں ہم دونوں ساتھ ہوتیں، کئی بار ٹیچر سے نظر بچا کر اپنی آنسر شیٹ ایک دوسری کو دکھاتیں کبھی کبھی امی سے چھپا کر اپنی تصویروں کا البم اسکول بیگ میں چھپا کر لے آتیں۔ فضہ میری نسبت صحت مند تھی تو قدرے سست بھی تھی، ہر کام آہستہ اور سستی سے کرنا اور ہر ٹیچر سے بے انتہا ڈرنا۔ کئی بار میں فضہ سے کہتی کہ تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ حالانکہ تمھیں کبھی سزا نہیں ملتی۔

یہ الگ بات ہے کہ کبھی سزا والا کام کرتی تو سزا ملتی۔ فارغ وقت میں اپنے گھر کی باتیں اور بہن بھائیوں کے قصے سنائے جاتے۔ فضہ کی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی بھی تھا۔ وہ کہتی کہ اس کی امی بہت سخت ہیں اور اسے اپنے ابو بہت یاد آتے ہیں اور جس دن فضہ نے مجھے بتایا کہ اس کے ابو فوت ہو گئے ہیں، اس وقت تک شاید مجھے فوت ہونے کا مطلب بھی نہیں پتا تھا۔

بیٹی کی جبلت میں باپ کی محبت ازل سے موجود ہوتی ہے خواہ باپ کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ میں جب کبھی اپنے ابو کا تذکرہ کرتی، فضہ بے انتہا اداس ہو جاتی۔

فضہ کی امی کو میں نے ریفرنڈم پر دیکھا تھا چھوٹا قد، درمیانی صورت، قدرے موٹی سی اور خوش لباس خاتون تھیں۔ ہمارے اسکول کے ساتھ ہی ایک بڑا پلے گراؤنڈ تھا جہاں شام کو بچے کھیلتے تھے۔ گراؤنڈ کے ساتھ ہی سرکاری ڈسپنسری اور اسکول تھا۔ جس دن ریفرنڈم ہوا، ہمارے لیے تو وہ کھیل کود اور چھٹی کا دن تھا، صبح سے شام تک

گراؤنڈ میں بچوں کی اچھل کود ہوتی رہی۔ فضہ کی امی اور دس پندرہ خواتین اسکول کی بلڈنگ میں تھیں، ہماری استانیاں اس دن ووٹ ڈلوا رہی تھیں۔

پہلی بار میرے کان لفظ ووٹ سے آشنا ہوئے تھے۔ مجھے جرنلسٹ کو دیکھنے کا بہت شوق تھا، کیونکہ کئی بار میری امی مجھے کہتیں تھیں کہ لگتا ہے تم نے بڑی ہو کر جرنلسٹ بننا ہے، تب شاید اس پیشے کی بہت قدر تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ جرنلسٹ کیا بلا ہے۔کسی نے کہا آج یہاں جرنلسٹ اور اخبار والے بھی آئیں گے، موقع اچھا تھا، میں انتظار کرتی رہی کہ دیکھوں یہ اخبار والے کیسے ہوتے ہیں؟ اتنی جلدی کیسے لکھتے ہیں اور اتنی زیادہ باتیں انھیں کیسے پتا چلتی ہیں؟

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور پولیس کے ساتھ ہی صحافیوں کی وین بھی آ گئی۔ انھوں نے عورتوں کو دیکھا، پھر آپس میں جانے کیا باتیں ہوئیں۔ انھوں نے دس پندرہ عورتوں کو کھینچ کر قریب قریب کھڑا کیا تا کہ فوٹو اتار کر اخبار میں لگا سکیں۔ اگلے دن اخبار میں فوٹو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ بہت رش میں لی گئی تصویر ہے۔

پولیس والوں کو پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا، نجانے کس جلدی میں تھے؟ استانیوں کو حکم ہوا کہ جلدی سے ساری کاپیوں پر دستخط کر دو، حکم کی تعمیل ہوئی، انگوٹھے لگانے کا مرحلہ آیا تو پولیس والے، فضہ کی امی اور کئی دوسرے لوگ ہاتھ کی ہر انگلی کو سیاہی سے رنگ کر ٹھپے لگا رہے تھے۔

فضہ کی امی میں مجھے کوئی جاذبیت نظر نہیں آئی تھی مگر میری اور فضہ کی دوستی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔ کم سنی سے لے بڑھوتری تک ہر سنگِ میل پہ ہم ساتھ تھیں۔ جب ہم پانچویں کلاس میں تھیں تو فضہ نے دوپٹا بھی اُوڑھنا شروع کر دیا جب کہ کلاس کی بیشتر لڑکیاں اسکول یونیفارم میں دوپٹے کے بغیر ہی اسکول آتی تھیں۔ فضہ کی اُٹھان بھی عام لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ مگر اٹھان زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، اصل بات ذہنی عمر کی ہوتی ہے اور ذہنی عمر میں وہ ہم سب سے پیچھے تھی یا آگے، مگر

ہمارے ساتھ نہیں تھی۔

تب میرا پسندیدہ مشغلہ انرجائل اور گلوکوز کو زبان پر رکھ کر ٹھنڈک کا مزہ لینا تھا، بسکٹ بھی میری دسترس سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ کئی بار گھر میں مہمان موجود مگر اسی وقت منگوائے گئے بسکٹ غائب ملتے۔ امی نے کھانے پینے پر کبھی روک ٹوک نہیں لگائی تھی۔ اور چٹخارے لے لے کر فضہ کو یہ سارے قصے سنانا روٹین کا حصہ تھے۔ فضہ کی کہانیاں قدرے مختلف ہوتیں۔ اس کی امی ہر کھانے والی چیز تالے میں رکھتی تھیں اور یہ بات کم از کم مجھ سے ہضم نہیں ہوتی تھی۔

کئی بار مجھے لگتا کہ فضہ جھوٹ کہتی ہے۔ کوئی بھی امی بچوں سے کھانے کی چیزیں لاک میں کیوں رکھیں گی؟

فضہ ابھی بھی ویسی ہی تھی معصوم سی، قدرے موٹی، گپلی سی، کئی بار اس کی باتوں سے لگتا کہ وہ ماں کے اتنا قریب نہیں ہے، بلکہ اپنے مرحوم باپ کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ اس کی ہر بات کا محور اس کے ابو ہی ہوتے۔

کبھی کبھار وہ اپنے ماموں اور خالاؤں کا تذکرہ بھی کرتی، مگر پھوپھو یا تایا چچا کا ذکر کبھی نہیں سنا تھا۔ فضہ کی امی کہیں جاب کرتی تھیں، مگر اس نے کبھی زیادہ نہیں بتایا۔ اتنی گہری دوستی کے باوجود نہ کبھی فضہ نے مجھے اپنے گھر بلایا اور نہ ہی کبھی ہمارے گھر آئی۔ ظاہر ہے ایک بیوہ اور ورکنگ وومین کے پاس اپنے بچوں کو گھمانے کا وقت کہاں سے نکلتا ہوگا۔

ٹین ایج میں بھی اکٹھے قدم رکھا۔ تب سوچ کا انداز اور پسند ناپسند تبدیل ہو رہی تھی۔ میری بڑی بہن کالج میں پہنچ گئی تھی اور اب ہمارے موضوعات میں آگے کیا کرنا ہے؟ کون سے مضامین اختیار کرنے ہیں؟ سائنس پڑھنی ہے کہ آرٹس، شامل ہو گئے تھے۔ نہ جانے ہم سب لڑکیوں نے کب سے خود کو بہت بڑا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اب ٹیچرز کے مذاق اُڑائے جاتے، کارٹون بنتے اور اُلٹے سیدھے ناموں سے نوازا جاتا۔

دیکھنا تو سہی یہ جو سائنس کی ٹیچر ہیں.... ان کی پی ایچ کافی کم لگتی ہے....

ایک قہقہہ بلند ہوتا....

بڑی ایسڈک ہیں.... ہاہاہاہا

ایک اور کھنکتا ہوا فلک شگاف قہقہہ.......

اور اردو ٹیچر کو دیکھو اُف! کتنی موٹی ہیں کپڑے ایسے پہنتی ہیں جیسے گلو لگا کر ساتھ چپکائے ہوں۔

پھر ایک قہقہہ.......

مگر سب سے مدھم آواز فضہ کی ہی ہوتی۔

فضہ تمھارے ابو ڈاکٹر تھے نا؟

ہاں۔ فضہ جواب دیتی

اچھا تو تم بھی ڈاکٹر بنو گی؟

پتا نہیں۔ وہ کہتی۔

مگر کیوں؟

پتا نہیں۔ امی کو پتا ہوگا۔

اس چھوٹے سے شہر کے لوگ مغربی تہذیب کے اتنے عادی نہیں ہوئے تھے۔ کوئی بھی انوکھا واقعہ لوگوں کے لیے نہ صرف اچنبھے کا باعث ہوتا بلکہ رنگین موضوع سخن بھی بن جاتا۔ شہر کے پوش علاقے میں ایک آنٹی نے ریستوران کھولا تھا اور اس کا خوب چرچا تھا۔ سنا تھا کسی اہم شخصیت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ہم لڑکیاں بھلا کب باز رہنے والی تھیں، ایک دن انھیں ریستوران والی آنٹی کا تذکرہ چل رہا تھا کہ فضہ میرا بازو کھینچ کر الگ لے گئی۔

اس کا گلا رُندھا ہوا تھا، کہنے لگی!

تم بھی سب کے ساتھ میری امی کا مذاق اڑا رہی ہو؟

میں نے حیرت سے پوچھا ''کیسے؟''

کہنے لگی کہ وہ ریستوران میری امی نے کھولا ہے۔

میں حیرت زدہ اس کا منہ تکتی رہ گئی، مگر دوبارہ کبھی اس کے سامنے اس کی امی کے متعلق کوئی بات نہ کرسکی۔

ہائی اسکول میں ہم دونوں الگ الگ سمتوں میں چل پڑیں، میں نے اسکول بدل لیا اور فضہ سے کبھی دوبارہ رابطہ نہیں رہا۔ اسکول پھر کالج پھر یونی ورسٹی نئی سے نئی سہیلیاں، نئے سے نئے لوگ مگر میں فضہ کو کبھی بھلا نہیں پائی۔ وقت اتنی جلدی بیت جاتا ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا اگر انسان کو یہ علم ہو جائے کہ سب سے قیمتی دولت کیا ہے تو وہ کبھی مادی چیزوں کے پیچھے لگ کر خود کو اتنا خوار نہ کرے۔

علم کیا ہے؟ ڈگریاں تو حصول روزگار کا ذریعہ ہیں یا پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت، وقت پیسہ اور انرجی ہمارے سب سے اہم اور قیمتی وسائل ہیں، ہم کبھی ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور کبھی ایک سے دوسرے کو تبدیل یا ری پلیس کرتے ہیں۔ وقت بچانا ہے انرجی خرچ کریں، کچھ وقت بچ جائے گا۔ انرجی چاہیے تو پیسہ خرچ کریں، پیسہ چاہیے تو وقت اور انرجی دونوں برباد کیجیے۔

میں کبھی بھی اتنی سوشل نہیں رہی، زیادہ دوستیاں کرنا تعلقات بنانا یا نبھانا نہیں آتے، مگر میری بہن کافی زندہ دل اور دوستانہ مزاج کی حامل ہے۔ کالج یونیورسٹی میں اس کی بہت سہیلیاں تھیں اور وہ سب سے ملتی۔ اس ایک سہیلی فضہ کی فرسٹ کزن بھی تھی جو یونیورسٹی میں میری سینیئر تھی۔ ایک دن اس سے پتا چلا کہ فضہ کی شادی کو تو عرصہ بیت گیا، اس نے تب میٹرک بھی نہیں کیا تھا، جب پیا دیس سدھار گئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور تھوڑا سا دکھ بھی کہ اتنی کم سنی کی شادی، اس عمر میں تو مجھے اپنے بالوں کی چٹیا بنانا بھی نہیں آتی تھی۔ پھر میں نے خود ہی دل کو تسلی دی کہ یتیم لڑکی ہے، اس کی ماں نے جلد فرض ادا کرنا مناسب سمجھا ہوگا۔ یہ بیٹیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمیشہ ان کے فرض

ماں باپ کی نیندیں اُڑائے رکھتے ہیں، خواہ ساری دنیا کا بوجھ اپنی پلکوں پر اٹھائے پھرتی رہیں، پھر بھی بوجھ ہی کہلاتی ہیں۔

الیکشن در الیکشن کا سلسلہ چل نکلا تھا، ہر دو ڈھائی سال بعد کے الیکشنوں نے عجیب بے دلی کی فضا پیدا کی ہوئی تھی۔ وہی لوگ جو ریفرنڈم پر ہر انگلی سے ٹھپے لگا رہے تھے، کبھی پی پی کی اور کبھی دوسری پارٹی میں موجود ہوتے۔ مہنگائی تو طے ہے کہ صرف اوپر کا سفر کرتی ہے نیچے کبھی نہیں آتی۔ یونیورسٹی میں طلبا کا موضوع سخن بھی الیکشن کے ساتھ سیاست اور ملکی نظام ہوتا پھر سے الیکشن کا میلہ سجا اور لمبی بحثیں شروع ہو گئیں۔

یونیورسٹی میں انھیں بحث مباحثوں میں میری بہت سی سہیلیاں بنیں مگر فریال اور عائشہ سب سے قریبی تھیں۔ ہر بات پر کھل کر اظہار اور اختلاف رائے کے باوجود فضہ کے بعد اگر دوستی ہوئی تھی تو انھیں دونوں سے۔ فریال کے والد ایک سرکاری محکمے میں اہم پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے وہ لوگ کئی شہروں میں رہے اور اس کا مشاہدہ ہم سب سے کہیں بہتر تھا۔ یونیورسٹی میں ہی ہماری جونیئرز میں ڈیرہ کے ایک سردار کی بیٹی ربیعہ بھی تھی، جب فریال کے والد کی پوسٹنگ ڈیرہ میں تھی تو وہ دونوں تب سے اسکول کی سہیلیاں تھیں۔ فریال کے ساتھ ساتھ ربیعہ سے بھی گہری چھننے لگی۔

علم بڑا ہے یا پیسہ؟ کیا انسان پیسے کے بغیر علم حاصل کر سکتا ہے؟ کیا تعلیم بکتی ہے؟ کیا علم سے یا ڈگری سے کوئی غریب انسان، کسی کسان کا بیٹا، کسی فیکٹری مزدور کا بیٹا بزنس مین یا صنعت کار بن سکتا ہے؟ کیا سرمائے کے حصول کے بغیر یہ سب ممکن ہے؟ فریال کہتی نہیں۔ پڑھ لکھ کر وہ اچھی نوکری کر لے گا تھوڑا سا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا، مگر مزدور کا بیٹا مِل کا مالک نہیں بنتا۔

میں کہتی، نہیں علم بڑا ہے۔ قائد اعظم کو دیکھو، نیلسن منڈیلا کو دیکھو، فریال صرف مسکرا دیتی۔ ایک دن اسی بحث و تکرار میں ربیعہ بھی شامل ہو گئی۔ میں، فریال اور عائشہ اس بات پر متفق تھیں کہ تعلیم سے انسان کا معیارِ زندگی کسی حد تک بہتر ہو سکتا ہے مگر

ربیعہ کہنے لگی، ''مجھے تمھارے شہر میں آ کر عجیب عجیب باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں، ساری لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔''

ارے پڑھ کر انھوں نے کون سا تیر مار لینا ہے، یہی کسی اسکول میں یا کالج میں استانیاں لگ جائیں گی۔''

فریال مسکرا کر کہنے لگی، اچھا ہے نا۔

ربیعہ نے کہا: خاک اچھا ہے، ان کو اتنی نوکریاں کون دے گا؟ جو کام ان کے باپ دادا کر رہے ہیں وہی ان لوگوں کو کرنے چاہئیں۔ اب دیکھو گرلز ہوسٹل کی جمعدارنی کی بیٹی بی اے کر رہی ہے۔ کل یہی لڑکی ہوسٹل کے باتھ روم دھونے پر تیار نہیں ہو گی۔ یہ سن کر مجھے خوامخواہ طیش آ گیا۔

مگر پھر بھی ضبط کر کے کہا ربیعہ کل کو جب ہماری قوم ترقی کرے گی تو ہم سب اپنے باتھ روم خود دھوئیں گے۔

ربیعہ کہنے لگی ارے یہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ میں نے کہا کہ ہمارے اسکول کی خاتون چپراسی کی بیٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے، تعلیم سے کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی حد تک تو ترقی کرے گا۔

فریال نے مجھے روکا، کہنے لگی چھوڑ دو بحث، تعلیم ان جاگیرداروں کی سوچ تبدیل نہیں کر سکتی۔

میں نے کہا کہ اسی لیے تو میں ان لوگوں کی سیاست کی مخالف ہوں، کیا نظام لائیں گے یہ لوگ ہمارے ملک میں جن کی سوچ صرف لوگوں کو دستِ نگر بنائے رکھنے تک محدود ہے۔

ربیعہ چلی گئی مگر بحث جوں کی توں جاری رہی، علم بڑا ہے یا پیسہ؟

میں نے کہا علم ہی بڑا ہے ہر حال میں علم ہی بڑا ہے.... عائشہ جو اکثر میری باتوں پر متفق اور ہم خیال ہوتی تھی مایوسی سے کہنے لگی، نہیں یار..... پیسہ ہی بڑا ہے۔

پچھلے سال ہمارے کالج کی سالانہ تقریبات میں وفاقی وزیر نیاز احمد کی بیگم مہمان خصوصی تھی۔ گورنمنٹ کالج کی پرنسپل اس کے سامنے بچھی جا رہی تھیں، دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور زیادہ دکھ تب ہوا جب اس وزیر کی جاہل بیوی نے مائیک ہاتھ میں لے کر پنجابی میں صرف اتنا کہا، (''تہاڈی میڈم نے کالج لئی بسا منگیاں سن... اسی اپنے کولوں دو بسا دے دتیاں نیں'') آپ کی پرنسپل نے کالج ٹرانسپورٹ کے لیے بسوں کی درخواست کی تھی، ہم نے اپنے پاس سے دو بسیں آپ کے کالج کو دے دی ہیں۔

نیاز احمد کا نام سیاسی حلقوں میں بہت معتبر نام تھا۔ مارشل لاء ہو یا جمہوری دور، ہمیشہ حکومت میں رہے جاگیردار، صنعت کار، اونچی فصیلوں والے محلات سے لے کر ذاتی طیارہ تک ملکیت میں تھا۔ اس الیکشن میں اس کا بیٹا صوبائی نشست سے اُمیدوار تھا۔ نیاز احمد کا نام بیچ میں آیا کہ نئی بحث شروع ہوگئی، نیاز احمد آج کل صنعت کاروں اور تاجروں کی پارٹی کے ساتھ تھا وہ ایسا سیاست دان تھا کہ جسے کسی بھی پارٹی کا ٹکٹ مل سکتا ہے۔

کبھی اس کو پارٹی ٹکٹ پارٹی لیڈر کی وفاداری پر ملتا، کبھی برادری کی بنیاد پر کہ اس حلقے میں اس کی برادری کے ووٹرز زیادہ تھے، کبھی اس علاقے میں اثر و رسوخ کی بنیاد پر، کبھی دھونس کبھی دھاندلی، کبھی چندہ کہ یہی جمہوریت کے پھندے ہیں۔

عائشہ دکھ سے کہنے لگی، اتنے سالوں سے میرے والد محنت کر رہے ہیں مگر کاروبار ترقی نہیں کر سکا۔ اس بار میرا بھائی نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی پارٹی کو سپورٹ کر رہا ہے کہ سیاست دانوں کی بیک سپورٹ ہو تو کاروبار میں ہی مدد مل جاتی ہے، اتنے سال والد نے ایمان داری محنت اور خلوص سے کام کیا۔ نتیجہ کیا، میں این سی اے میں نہیں پڑھ سکی کہ وسائل اتنے نہیں تھے، بڑی بہن کی شادی، گھر کے اخراجات سب منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔

اب بھائی نے موجودہ حالات کے مطابق اپنا راستہ چُن لیا ہے۔ فریال نے کہا

کہ بات وہی ہے، اپنے کاروبار کو سپورٹ دینے کے لیے یہ لوگ سیاست کرتے ہیں، ہماری خدمات کے دعوے اور منشور تمھارے جیسے کتابی لوگوں کو اُلو بنانے کے لیے ہوتے ہیں۔

اسی دن شام کو مجھے اپنی بہن کے ساتھ اس کی سہیلی کی سالگرہ میں جانا تھا، فضہ کی کزن کے گھر پارٹی تھی، میں نے اس لیے حامی بھر لی کہ شاید فضہ سے یا اس کی امی سے ملاقات ہو جائے، جب بھی فضہ کا ذہن میں خیال آتا تو پہلا احساس یہ ہوتا کہ اتنی کم عمری کی شادی، صرف پندرہ سال کی لڑکی، اب تو اس کے دو یا تین بچے بھی ہوں گے۔ پتا نہیں اب دیکھنے میں کیسی لگتی ہو گی؟

خوش شکل تو وہ تھی ہی اب کافی پیاری ہو گئی ہو گی۔ انھیں سوچوں میں گم شام کو تقریب میں پہنچ گئی، جب فضہ کی کزن سے فضہ کا پوچھا کہ فضہ کہاں ہے؟ پارٹی میں آئی کیوں نہیں؟ اس کے کتنے بچے ہیں؟ ٹیلیفون نمبر ہی دے دو؟ اس نے طنزیہ نظروں سے میرے سوال سنے اور کہا تمھیں پتا ہے فضہ کی شادی کہاں ہوئی ہے؟ جواب سن کر میں سکتے میں آ گئی، ایک چیخ میرے اندر اُٹھی مگر میں آج تک اس چیخ کو باہر نہیں نکال سکی۔ پیٹ میں ایک دم سے درد کی شدید لہر اُٹھی اور میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گی۔

فضہ کی شادی پندرہ سال کی عمر میں نیاز احمد سے ہو گئی تھی۔ سب سوال فضول تھے، ایسی شادیاں جو صیغہ راز ہی میں رہتی ہیں۔ ایسی بیوی جو معاشرے میں آ کر شوہر کا نام تک نہیں بتا سکتی، ماں نہیں بن سکتی، نکاح ہو بھی جائے تو اعلان نہیں ہوتا......شادی نہیں ہوتی...... پتا نہیں کیا ہوتی ہے؟

ایک دم سے ذہن میں بے شمار فلیش بیکس آنے لگے۔

چل چل چنبیلی! باغ میں میوہ کھلاؤں گی....ریستوران کی سرپرستی....

کاش میرے ابو زندہ ہوتے

ریفرنڈم......سیاہی کے دھبے....

جاگیرداروں کی.... صنعت کاروں کی حکومت.... اُونچے محل
میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی....
بڑے سرمایہ دار.... ہیلی کاپٹر....
چادر کا پلو پھٹ گیا۔
شاہین اب اُونچی پرواز نہیں کرتا....
لارنس آف تھلیپیا.... تھر کی لالیوں پر پلتا ہے.....
اُڑان اب طیاروں کے ساتھ ہے ... کاروبار کا تحفظ ... کم سن لڑکیوں کی قربانی۔

گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، ہلدی لگاؤں گی
اُونچی فصیلوں سے چیخ باہر نہیں آتی...

میرے درد کو جو زباں ملے.... تشنہ لب خاموش..... کسی نے سارے جسم کی سوئیاں نکال چھوڑی تھیں مگر آنکھوں کی رہنے دیں۔ زمانے کے ساتھ حیلے تراشنے والوں پر ایسا غضب پڑا .... باہر سے تو سب انسان ہی رہے، مگر اندر سے جون بدل گئی۔ شیر کہلانے والے لگڑ بھگڑ کی طرح ہنسنے لگے۔ شاہین کے بال و پر گرنے لگے، سر اور گردن پروں سے محروم ہوئے .... پیٹ بڑھتا گیا۔ پتا نہیں کیسی بھوک ہے جو مٹتی ہی نہیں؟ ....

آنکھیں اندھی رہیں، کچھ دکھائی دیا نہ سجھائی دیا، آنکھوں کے زخم بھی عجیب ہوتے ہیں، ہلدی بیچاری کیا کرے؟

◆

سولہ کا پہاڑہ

ماسٹر صاب اگر بچوں پر سختی نہ کی، ان کی تراش خراش نہ کی تو یہ ہیرا نئیں بنے گا..........کوئلہ رہ جائے گا نِرا..............

''بس ہڈیاں سَاڈیاں تے ماس تُوہاڈا۔''

میاں جی نے ٹیوشن پڑھانے آئے ماسٹر سے یہ کہتے ہوئے دو دن پرانے اخبار میں سر چھپا لیا۔ مارشل لاء کے دن تھے خبریں سنسر ہو کر شائع ہوتی تھیں پھر گاؤں میں اخبار بھی دیر سے پہنچتا تھا۔

دونوں ہاتھ بید کھانے کے لیے سامنے پھیلائے چھ سالہ مزمل سولہ کا پہاڑہ سنا رہا تھا۔

سولہ تیا..........پینتالیس.......

ایک زوردار بید پڑا.........

مزمل نے تکلیف سے کراہنے پر اکتفا کیا اگر روتا تو دوسرا بید کمر پر پڑنا تھا۔ دہرائی کرنے کے باوجود اس دن پھر مزمل کو سولہ کا پہاڑہ بھول گیا تھا۔ بار بار مزمل کا دھیان گاؤں کی اوڑیوں سے پرے امرود کے باغوں کی طرف سے اڑ کر آتے، ہوا میں مختلف شکلوں میں ڈھلتے ہزاروں پرندوں کی طرف چلا جاتا۔ دور افق پر سورج ڈوبنے والا تھا۔ آسمان شفق کے رنگوں اور بادل کی ٹکڑیوں سے سجا ہوا تھا۔ آٹا پیسنے والی چکی کی

ہوک ہک ہوک ہک پورے گاؤں کی فضا میں ایک خوب صورت صوتی ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس شام ہائی سکول کے بڑے گراؤنڈ میں لڑکوں کا ہاکی کا میچ تھا۔ ان کے گاؤں کا ایک لڑکا جو اسی سکول میں ہاکی کھیلتا رہا کالج کی ٹیم سے ہوتا قومی ٹیم میں شامل ہو چکا تھا۔ مزمل کو اس لڑکے کو ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت یا تو وہ آسمان پر اڑتی بے شمار چڑیوں کی شبیہیں دیکھے جو کبھی کسی شکل میں ڈھل جاتیں تو کبھی کسی میں یا پھر سکول کے گراؤنڈ میں جاری میچ دیکھنے چلا جائے۔ مگر اس کے دادا میاں جی مختار سارا دن اسے ریاضی میں طاق کرنے کے لیے خود بھی دہرائی کرواتے اور شام کو ماسٹر صاحب بھی گھر ٹیوشن پڑھانے آجاتے۔

میاں جی بڑے فخر سے سب کو بتاتے کہ ان کے سات سالہ پوتے کو سولہ تک کے پہاڑے ازبر ہیں جمع تفریق اور ضرب کرنا بھی سیکھ گیا ہے۔ وہ اسے انجینئر بنائیں گے تاکہ اپنے باپ دادا کے نام کی لاج رکھے۔

دوسری طرف مزمل کی ماں ثمینہ نے گھر پر آیت کریمہ کا ورد شروع کروایا ہوا تھا۔ تین دن ہو چکے تھے مگر سوا لاکھ کا ورد مکمل نہیں ہو رہا تھا۔ عورتیں پانی پینے کے بہانے بڑے دالان سے باہر نکلتیں تو واپس نہ آتیں۔ چند ایک تو دبے لفظوں میں کہتیں آیت کریمہ خود گرم ہوتا ہے ایسے شدید گرم موسم میں اس کا ورد؟

پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں ''ربا سوہنیا ثمینہ کی مشکل آسان فرما دے۔''

گندم کی کٹائی تو مہینہ بھر پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی لو اتنی شدید چلتی کہ دوپہر کو کوئی پرندہ بھی آسمان پر اڑتا نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے میں سبھی عورتیں ثمینہ سے پوری ہمدردی اور آیت کریمہ کی فضیلت سے عقیدت رکھنے کے باوجود ورد میں شامل نہ ہو رہی تھیں تو کون سی عجیب بات تھی۔ پانچ دن بعد بھی جب صرف ساٹھ ہزار تسبیحیں مکمل ہوئیں تو ثمینہ نے مایوسی سے سب عورتوں کو ورد ختم کرنے کا کہہ دیا۔ اس کے سسر میاں جی مختار جنھیں بچے بڑے سب لوگ جی مختار کہا کرتے تھے ان سے یہ بات پوشیدہ رکھی گئی کہ

ورد مکمل نہیں ہوا۔

اور رات کے وقت ثمینہ کھلے صحن میں سوتی بان کی چارپائی پر لیٹی ستاروں کو تکتے سوچتی رہی مچھلی کے گرم بطن میں یونس علیہ السلام نے جانے کس طرح آیت کریمہ پڑھا ہوگا؟ پیغمبروں پر تو آزمائشیں بھی بڑی آتی ہیں مگر اس کا شوہر مسعود نہ ولی نہ پیغمبر۔ بس بہتر مستقبل کی تلاش میں مشرق وسطی جانے والے لوگوں کی دیکھا دیکھی اس پر بھی باہر کی کمائی کا بھوت سوار ہوا تھا۔ مگر شومئی قسمت مسعود شادی کے ایک سال بعد ہی دبئی یا کویت کی بجائے لیبیا جا پہنچا۔ پختہ گھر اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم، زمین کاشت کرنے کے لیے ٹریکٹر تھریشر اور اپنے مختصر سے کنبے کی خوشحالی کے چھوٹے موٹے خواب آنکھوں میں سجائے مسعود جب لیبیا گیا تو اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہاں سے کوئی شخص نہ تو اپنی کمائی وطن بھیج سکتا ہے اور نہ ہی آسانی سے واپس آ سکتا ہے۔ چھ سال ہو گئے تھے اس اجنبی ملک میں دن رات مشقت کرتے مگر ایک پائی پیچھے بھیجنے کا اختیار نہ تھا۔ ثمینہ کو لگتا کہ یہ گرم ملک بھی حوت کا بطن ہیں جو جانے کتنے مسافروں کو نگل چکے ہیں۔ شوہر کی وطن واپسی کے لیے ہی اس نے آیت کریمہ کا ورد شروع کیا تھا نہ ورد مکمل ہوا اور نہ ہی مسعود باوجود کوشش کے واپس آ سکا۔

میاں جی مختار جالندھر سے مہاجر ہو کر لائل پور کے نواحی گاؤں میں آن بسے تھے کلیم پر پندرہ ایکٹر زمین بھی مل گئی تھی۔ ان کی بس ایک ہی نرینہ اولاد حیات رہی۔ اس گاؤں میں عیسائیوں کے کچھ گھروں، کمہاروں اور جولاہوں کے علاوہ بیشتر لوگ جالندھر اور گورداسپور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ زیادہ تر لوگ ذات کے ارائیں تھے اور کھیتی باڑی کے علاوہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔

گاؤں میں لڑکوں کا ہائی سکول تھا اور لڑکیوں کا مڈل سکول۔ کالج پڑھنے کے لیے انھیں یا تو روزانہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قریبی قصبے میں موجود کالج تک پیدل جانا پڑتا یا پھر کچھ والدین جو ذرا خوشحال تھے اپنے بچوں کو شہر کے ان تعلیمی اداروں میں بھیج

دیتے جہاں انھیں ہوسٹل کی سہولت میسر ہوتی۔

جی مختار جو ساٹھ کا پیٹا عبور کر چکے تھے بہت بارعب اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ اگرچہ ان کی بھنوؤں تک کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ سخت کوش اور اچھی صحت کے مالک تھے۔ ہمیشہ سفید براق قمیض کے ساتھ تہبند پہنتے آنکھوں پر عینک موجود ہوتی اور ہاتھ میں عصا کر لے چلتے۔ چرمی جوتوں کی مخصوص آوازیں ان کی آمد کا دور سے پتا دیتیں مگر پھر بھی گھر داخل ہوتے وقت ہمیشہ گلا کھنگارتے اور ان کی بہو دوپٹہ سر پر جما لیتی۔

مکھناں.......او میرا سوہنا پتر ایدھر آ

اور مزمل جی دادا جی کہتا فوراً آن موجود ہوتا۔

ویخ مکھناں توں ریاضی ول دھیان دے کوئی سبق نہ پول اِیں۔

اور جواباً مزمل فقط سر ہلا دینے پر اکتفا کرتا۔

ماسٹر صاب دی ہر گل دھیان نال سنیا کر کاکا۔

کئی بار جب ٹیوشن پڑھنے اور مار کھانے کے بعد مزمل روہانسا نظر آتا تو اسے پچکارتے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہتے وڈیاں دیاں گالاں تے گھیو دیاں نالاں۔

اور مزمل چاہتے ہوئے بھی ان سے اپنی خواہشات کا اظہار نہ کر پاتا۔

مسعود لیبیا سے پیسے نہیں بھیج سکتا تھا اور زرعی زمین حصہ پر دینے کی وجہ سے آمدن کم تھی مگر ان کی بہو اپنی سلیقہ شعاری سے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھی۔ ہٹی سے چھوٹا موٹا سودا سلف تو گندم کے دانوں کے عوض ہی مل جاتا تھا۔ سال بھر کی آمدن کے پیسے وہ بہت کفایت شعاری سے برتتی۔ جی مختار اور مزمل ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہوتے۔ گھر آئے مہمان کی آؤ بھگت بھی خوب ہوتی۔

گاؤں کی مٹی میں مہر و محبت گھلی ہوئی تھی کم و بیش ہر گھر کی چھت کے درمیان میں

گول روشن دان بنے ہوئے تھے۔ جن کے اوپر مٹی کی بڑی ہانڈیاں یا کنالیاں الٹی دھری ہوتیں کہ اگر بارش ہو تو اس کا پانی گول موگھوں سے کمروں کے اندر نہ گرے۔ چھت کے درمیان میں موجود یہ موگھے روشنی دھوپ کے علاوہ عزیز رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی محبت کی سبیل بھی تھے۔ بیشتر گھروں کی چھتیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں جب کسی نئی فصل پھل یا سبزی کی کٹائی ہوتی تو بنا بتائے بنا احسان جتائے ایک دوسرے کے گھروں کی چھت میں موجود روشن دان سے مکئی، پیاز، آلو، امرود، کنو اور دیگر چھوٹی موٹی سوغاتیں کمرے میں بچھی چارپائیوں پر ڈال دی جاتیں۔ اور اس بقائے باہمی سے پورے گاؤں کو مستفید کیا جاتا۔ عموماً کسی گھر میں اناج یا راشن کی سخت تنگی دیکھنے میں نہ آتی۔ پڑوس میں رہنے والی کمہارنیں سال کے سال ثمینہ کے ساتھ مل کر گھر کی دیواروں کو مٹی تُوڑی سے لیپ کر خوب صورت نقش و نگار بنا دیتیں۔ یہ لیپ اور گھروں کی سالانہ تزئین جی مختار کی تاکید پر عموماً بابا گرونانک سنگھ کی سالانہ تقریبات سے قبل کی جاتی تاکہ اگر سکھ یاتریوں میں سے کوئی اپنا پرانا گھر دیکھنے اس گاؤں کا رخ کرے تو انھیں اپنے چھوٹے ہوئے آبائی گھر صاف ستھرے نظر آئیں۔

گاؤں کے کئی جوان جو دوسرے ممالک میں برسرِ روزگار تھے جب گاؤں واپس آتے تو اپنے ساتھ نت نئی مشینیں، آسائشیں اور خیالات لے کر آتے۔ گاؤں سے باہر کئی ڈیروں میں ٹریکٹر ٹرالیاں کھڑی نظر آنے لگیں۔ جب مڈل اور میٹرک کے سالانہ امتحانات ہوتے تو ٹرالیوں میں پرالی بچھا کر اوپر ترپالیں ڈال کر امتحان میں حصہ لینے والے تمام طالب علموں کو ایک ساتھ دور قصبوں میں بننے والی امتحانی مراکز تک پہنچایا جاتا۔

آمدنی بڑھی، گھروں کی چھتیں پختہ ہونے لگیں تو کچی چھتوں کے درمیان میں موجود گول روشندان بھی غائب ہوتے گئے۔ پڑوسیوں کی محبتوں کے بیچ بھٹوں پر پکی پختہ اینٹیں حائل ہونے لگیں۔ انھیں دنوں گاؤں کی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہوا جب خلیجی

ممالک سے پلٹے چند اشخاص اور کچھ نوجوانوں نے گاؤں میں ایک الگ مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ پہلے پہل تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بتایا ہی نہیں گیا کہ یہ کوئی مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ جب تعمیر کے بعد مسجد کے باہر الگ فرقے کی چھوٹی سی تختی آویزاں کی گئی تو سارے بزرگ بہت جز بز ہوئے۔ گاؤں کی پہلی اور بہت عرصے تک اکلوتی مسجد کے پیش امام حافظ امام دین نابینا تھے اور بہت ضعیف ہو چکے تھے مشہور تھا کہ جنات ان سے قرآن کی تعلیم لینے آتے ہیں۔ انھوں نے شادی بھی نہیں کی تھی اور ساری عمر گاؤں کے بچوں کو قرآن مجید کا سبق پڑھاتے گزار دی تھی۔ اسی دوران دوسرے شہر سے ایک نئے قاری صاحب بھی محکمہ اوقاف کی طرف سے پرانی مسجد میں تعینات ہو کر آ گئے تھے۔ ان تبدیلیوں کے بعد گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ جن کا بیشتر مذہبی سرمایہ عقیدت و احترام پر مبنی تھا کئی نئے احکام اور مسائل سے آگاہ ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھیں فروعی اختلافات کی موجودگی کا باقاعدہ علم ہوا۔ نابینا حافظ تمام معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر گئے اور امامت چھوڑ کر اپنے گھر پر بچوں کو درس قرآن دیتے ایک دن چپکے سے اپنے خالق حقیقی کو جا ملے۔

میاں جی مختار کی ہمت کچھ گاؤں کے بدلتے منظر نامے سے اور کچھ بیٹے کی جدائی میں جواب دینے لگی تھی۔ دنیا کے حالات دیکھتے ہوئے ان کی اپنے پوتے پر سختی روز بروز بڑھتی گئی۔ بیٹے کی غیر موجودگی میں پوتا ہی ان کا کُل سرمایہ حیات تھا۔ اخبار میں چند ایک بار کمسن لڑکوں سے بدفعلی کی خبریں پڑھیں تو مزید گھبرا گئے۔ مزمل کے عمر سے بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے یا اکیلے باہر جانے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔

ثمینہ کی بہن جو شہر میں رہتی تھیں جب کبھی گاؤں آتی تو مزمل کی اتنی کڑی نگرانی اور ٹیوشن پڑھانے والے ماسٹر صاحب کی دی ہوئی سخت سزائیں دیکھ کر کہتی کہ ثمینہ بچوں پر اتنی سختی مناسب نہیں۔ کچھ بچے سپرنگ جیسے ہوتے ہیں دباؤ سے پالش نہیں ہوتے بلکہ دب جاتے ہیں اور کسی وقت جب یہ دباؤ ہٹ جائے تو ردعمل میں اچھل کر ساری تربیت

خاک میں ملا دیتے ہیں۔

مزمل کڑی نگرانی اور پڑھائی کی وجہ سے ہر سال جماعت میں اول درجے پر فائز ہوتا اور جی مختار کا سینہ فخر سے پھول جاتا لیکن پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے مزمل کو بہت سخت محنت کروائی جاتی۔ وہ اندر ہی اندر پڑھائی سے بد دل ہوتا جا رہا تھا اس کا بہت دل چاہتا کہ سکول کی کھیلوں میں حصہ لے۔ لمبی دوڑ، ہاکی یا والی بال کا میچ جیتے اور شام کو گھر سے باہر دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلے یا رسی کے ساتھ لٹو گھمانے کا مقابلہ کرے۔ وہ پانچویں جماعت میں پہنچ چکا تھا ریاضی سمیت سارے مضامین میں اچھے نمبر لیتا مگر سولہ کے پہاڑے پر آ کر اکثر اٹک جاتا۔

جمعہ کی شام تھی ہفتہ وار چھٹی کا دن تھا اور لڑکوں کی کئی ٹولیاں بڑے میدان، کھدّو کھینی، گلی ڈنڈا اور ہاکی کھیل رہی تھیں۔ گاؤں کے بیشتر مرد پاس ہی چوپال میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ برگد کے پیڑ تلے بنے پکے تھڑے پر بیٹھا شخص آنکھیں موندیں پرسوز آواز میں بابا بلھے شاہ کا کلام سنا رہا تھا۔

کاں، لگڑاں نوں مارن لگّے، چڑیاں، جُرّے ڈھائے
گھوڑے چُگن اوڑیاں تے، گدّوں خوید پوائے
سچّیاں نوں پئے مِلدے دَھکّے، جُھٹے کول بہائے
اگلے ہو کنگالے بیٹھے، پچھلیاں فرش بِچھائے

بُھریاں والے راجے کیتے، راجیں بھیک منگائے
بُلّھیا! حُکم حضوروں آیا، تِس نوں کون ہٹائے

اُلٹے ہور زمانے آئے، تاں مَیں بھیت سجن دے پائے

میاں جی کو لگا جیسے بلھے شاہ بھی کہیں انھیں کے زمانے میں جی رہے سب کچھ سہہ رہے ہوں۔ ان کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگی۔ پچھّم کی طرف آسمان پر سرخ آندھی نمودار ہو رہی تھی کہ دور کماد کے کھیتوں میں ہاہا کار مچ گئی۔ گنّے توڑنے کے لیے گئے کچھ لڑکوں نے خون دیکھا تھا۔ سب چوپال چھوڑ کر کھیتوں کی طرف بھاگے مگر وہاں کا دلخراش منظر دیکھ کر سبھی کے کلیجے مونہہ کو آ گئے۔ گھنے کماد کے بیچوں بیچ کئی ٹکروں میں بٹی ایک جوان عورت کی لاش پڑی تھی جسے کلہاڑی کے وار کر کے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ مزمل خوف زدہ ہونے کے باوجود سب دیکھنے سے باز نہ آیا۔ وہ اس کے ماسٹر کی بیوی تھی۔ ماسٹر برسوں سے بے اولاد تھا علاج کرانے کی بات پر اس کا بیوی سے چند روز قبل جھگڑا ہوا تھا۔ پولیس آئی شواہد اکٹھے کئے اور ماسٹر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ سارا گاؤں اس سانحے سے سہم کر رہ گیا۔

میاں جی اس واقعے کے بعد بہت آزردہ ہوئے۔ انھیں ایک معصوم عورت کے قتل کا دکھ تو ہوا ہی ساتھ ہی شدت سے یہ احساس ستانے لگا کہ اپنے پوتے کی تعلیم کے لیے انھوں نے ٹھیک استاد کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ بڑی فکرمندی سے یہ سوچنے لگے تھے کہ سارے معاشرے میں کچھ غلط تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ وہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یا دانشور تو نہ تھے جو ان تبدیلیوں کا تجزیہ کر سکتے مگر انھیں اپنی مٹی سے دیمک کی بساند آنے لگی تھی۔ انھیں دنوں افغان جہاد بھی پورے زور و شور سے جاری تھا ان کے گاؤں کے کئی نوجوان لڑکے ان افکار سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان کے خیالات گفتگو اور نظریات میں جو تبدیلی آئی وہ میاں جی کو عجیب سی الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ دوسرے بزرگوں کی طرح انھیں بھی تشویش تھی کہ نئی نسل میں مہر و مروت کی اقدار کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ ان کی ہمت تو نہ ٹوٹی مگر صحت جواب دینے لگی۔ بظاہر بڑے مضبوط بنے رہنے کے باوجود معاشرے کے تیزی سے بدلتے حالات، بیٹے کی طویل جدائی انھیں گھن کی طرح اندر ہی اندر کھانے لگی۔ انھیں سمجھ نہ آتی کہ کس طرح اپنے پوتے کا پہلے

کی طرح دھیان رکھ سکیں۔

میاں جی چارپائی سے جا لگے اور ٹیوشن پڑھانے والے استاد کو اپنی بیوی کے قتل کی سزا میں جیل ہوگئی یوں مزمل کی پڑھائی کی طرف کسی کا دھیان نہ رہا۔ میاں جی کی بیماری کے دوران ایک دن مسعود بھی واپس لوٹ آیا اور میاں جی نے مزمل کا ہاتھ اپنے بیٹے کو پکڑاتے ہوئے کہا!

''مسعود پتر سانبھ اپنیاں امانتاں......... میرا اخیر ویلا آ گیا بس تیرا انتظار سی۔''

مسعود کی آمد کے بعد وہ چند دن ہی زندہ رہ سکے۔ گاؤں والے کہتے تھے کہ شاید بیٹے کے انتظار اور پوتے کی دیکھ بھال میں ہی وہ اپنی سانسیں گھسیٹ رہے تھے۔ میاں جی کے انتقال پر مزمل کی عجیب کیفیت تھی اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اداسی رنج کے ساتھ ساتھ من کے اندر ہی اندر آزادی کی عجیب سی تسکین کا احساس بھی تھا۔

میاں جی کے گزر جانے کے بعد مسعود نئے سرے سے گھر کے حالات سنوارنے دبئی چلا گیا۔ وہ سال بعد چھٹی پر وطن واپس آتا اور گھر میں آمدن کے علاوہ دو نئے افراد کا اضافہ بھی ہوا۔ ثمینہ کی زیادہ توجہ اپنے چھوٹے بچوں کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ مزمل روز بروز پڑھائی میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ماضی میں تو ٹیوشن والے استاد کے تشدد کا نشانہ بنتا تھا۔ مگر پھر سکول میں ہر استاد سے مار کھانے لگا۔ مار کھا کھا کر وہ اتنا ڈھیٹ بن چکا تھا کہ ذرا شرمسار نہ ہوتا بلکہ الٹا استادوں کو نفرت سے گھورتا رہتا۔ گاؤں کے مختلف سکولوں کے درمیان سالانہ کھیلوں کے مقابلے ہر سال مؤخر یا موقوف ہونے لگے۔ سکول کی عمارت بھی مخدوش ہو چکی تھی اور بیشتر پڑھے لکھے خاندان بڑے شہروں کی جانب نقل مکانی کرنے لگے۔

ان کے چک تک پختہ سڑک تعمیر ہوئی تو دوسرے دیہات اور قصبوں سے لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھنے لگی اور مزمل کا واسطہ نت نئے لوگوں سے پڑا۔ کچھ نوجوان

برے اطوار کا شکار ہو رہے تھے تو کئی ایک شدید مذہبی رجحانات اپنانے لگے۔ انھیں میں سے کئی نوجوان محض ایڈوانچر سمجھ کر افغانستان میں موجود جہادی کیمپوں سے دورہ خاصہ تک مکمل کر آئے تھے۔ نئی نسل میں شدید رجحانات پکی فصل کی مانند واضح اور نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ گھر والوں سے ذہنی طور پر دور مزمل کا اٹھنا بیٹھنا ہر طرز کے لوگوں میں ہونے لگا، ثمینہ کو آئے روز اس کی شکایات کا انبار ملتا مگر جوان ہوتے بیٹے پر اس کا زور نہ چلتا۔ سپرنگ پوری شدت اور طاقت سے الٹ چکا تھا۔

کالج میں پڑھائی ادھوری چھوڑ کر وہ پہلے ایک مذہبی تنظیم میں شامل ہوا چند تربیتی دوروں میں حصہ لیا پھر جلد ہی اکتا کر ایک بڑی سیاسی جماعت میں شامل ہو گیا۔ اسی سیاسی جماعت کے ایک وزیر نے اسے اپنے خاص کارندوں میں شامل کر لیا۔ وہ آئے دن گھر سے غائب ہونے لگا اور اس کی ماں راہ تکتی رہتی۔ پہلے پہل تو اس کے والدین کو یہی خدشہ تھا کہ ان کا بیٹا سیاسی کارندہ بن کر اپنے خاندان سے دور ہو چکا ہے مگر ان کے قدموں تلے سے زمین اس وقت کھنچی گئی جب انھیں علم ہوا کہ مزمل ڈکیتی اور فائرنگ کی کئی وارداتوں میں مطلوب ہے۔ اس کے سیاسی سرپرستوں کی آشیرباد سے اس پر قائم چھوٹے موٹے مقدمات خارج ہو جاتے اور وہ اپنے آقاؤں کے لیے ہر غیر قانونی کام بہت بے خوفی سے سرانجام دیتا۔

ثمینہ اسے رو رو کر کہا کرتی کہ پتر گھر لوٹ آ جن لیڈروں نے تجھے پالا ہے ایک دن وہی تجھے جانور کی مانند قربان گاہ پر چڑھا دیں گے۔ مگر مزمل کہنے سننے کے دور سے گزر چکا تھا۔

مسعود کئی بیماریوں میں گھرا مستقل طور پر وطن لوٹ آیا۔ لاڈلے بیٹے کی بے راہ روی ایک ایسی آزمائش بن چکی تھی کہ اسے اپنے باپ ہونے پر شرمساری ہونے لگی۔ لوگوں کی باتوں کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے انھوں نے شہر میں جا بسیرا کیا۔ ثمینہ بیٹے کے لیے تڑپتی مگر زبان سے اظہار نہ کر سکتی تھی۔ اِس بار اُس کی ممتا بھی حوت کے

بطن میں مقید ہو چکی تھی۔ کھلے آسمان تلے سونے کی پرانی عادت سے مجبور وہ اکثر اپنی چارپائی چھت کے اوپر ڈال لیتی اور رات ستاروں کو تکتے سوچا کرتی کہ جانے آیت کریمہ کے کتنے ورد ان سب کی کوتاہیوں کا، اپنے ہی بیٹے پر سختی کا مداوا بنیں گے جن کی وجہ سے اسے معاشرے میں منہ کھولے شکاریوں نے اُچک لیا تھا۔

اسی طرح چند سال اور بیت گئے پھر ایک دن بنک میں بڑی ڈکیتی کی واردات کے دوران مزمل گرفتار ہو گیا۔ اس کے سیاسی آقاؤں کے لیے اس کی پولیس حراست نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ عدالت میں پیشی پر اس کے ساتھیوں نے ضلع کچہری سے ہی اسے فرار کروانے کا منصوبہ بنایا اور مزمل تک اطلاع پہنچا دی گئی کہ اسے عدالت کے احاطے میں ہی پولیس کی حراست سے نکال لیا جائے گا۔

دوطرفہ فائرنگ میں ہتھکڑیوں سمیت بھاگتے کئی گولیاں مزمل کے بازوؤں، پیٹ اور پاؤں پر لگیں۔

چھبیس سالہ جوان گرم لہو مٹی میں جذب ہوتا جا رہا تھا اس نے تڑپتے ہوئے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں سمیت آگے بڑھا دیے۔

جیسے چھ سالہ مزمل بید پڑنے کا انتظار کر رہا ہو.............

سولہ .... کولا .... کوئلہ .... سولاں تیا .... پنتالی .... چھیالی

س .... سس..........

سُبحَانَکَ اِنّی کُنتُ مِنَ

اِنّی کُنتُ مِنَ

سس .... سولہ تیا........... گول ای اوئے .... تیا اڑتالیس۔

شاید میاں جی آ کر سینے سے لگا لیں..........

شاید آج ماں اپنے دامن میں چھپا لے اور کہے جا پتر میچ کھیل لے ....

مگر سامنے نہ تو ماسٹر تھے، نہ میاں جی اور نہ ہی ماں.........

ہر طرف وردی میں ملبوس نفری اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اس نے آنکھیں موند لیں۔

دنیا کی حوت نے اپنا شکار مٹی پر اگل دیا تھا۔

جامن کا پیڑ

خزاں کے پتے بھی پیغام رساں ہوتے ہیں جو گئے وقت کے قاصدوں کی مانند پیغام پہنچاتے اپنا سر قلم کروا لیتے ہیں۔ اس بستی کی ہواؤں نے کتنے ہی پتوں پر پیغام لکھ لکھ کر مجھے بھیجے تھے۔ کئی سر کٹے قاصد پیلا لباس پہنے میرے اردگرد پتنگوں کی مانند رقصاں ہیں۔ اور میں خشک ٹہنیوں کا الاؤ جلائے اس کے لکھے خطوط پڑھ رہا ہوں۔

جامن کے ٹہن کچے ہوتے ہیں پھر بھی انھیں پھلوں کے باغات کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ مون سون ہواؤں کی وجہ سے جب تیز آندھیاں چلتی ہیں تو جامن کے بلند درخت ان ہواؤں کا زور توڑ کر آم کے کچے پھل ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔ کئی بار مجھے لگتا ہے کہ میں بھی کچے ٹہن والا جامن کا ایک پیڑ ہی ہوں۔

ابھی کچھ دیر میں میری بیوی آئے گی اور تڑخ کر پوچھے گی کہ مَیں اتنی سردی میں چھت پر کیا کر رہا ہوں۔ یہ بیویاں بھی عجیب ہوتی ہیں شکی واہمی یا شاید حقیقت کی وہ کھوج لگا لینے والی جو سات پردوں میں چھپا کر بھی رکھی گئی ہو تو ڈھونڈ نکالیں۔

آگ میں خشک لکڑیاں چیخ چیخ کر کوئلہ ہوتی جا رہی ہیں۔ میرے اندر اور باہر کی سلگتی آوازیں ہیولوں کی مانند دھوئیں کے مرغولوں کے ساتھ رقصاں ہیں۔

گوجرانوالہ سے کشمیر تک کا فاصلہ کچھ کم تو نہ تھا۔ مگر میرا اکثر وہاں جانا ہوتا۔ کبھی ادھار پر بھیجے سینیٹری ٹائلز اور فٹنگز کے پیسے وصول کرنے تو کبھی نئے گاہکوں کی تلاش میں

جانا ہوتا۔ ابا کے گزرنے کے بعد بہت جلد مجھے اپنا خاندانی کاروبار سنبھالنا پڑا تھا۔ مجھے کشمیر کی سرسبز وادی چشمے آبشاریں اور دریائے نیلم اتنا ہی پر کشش لگتا جتنا کسی بھی میدانی علاقے سے آئے سیاح کو لگتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آئے دن اس وادی کے سفر نے ان سب نظاروں کو میری روٹین کا حصہ بنا دیا تھا۔

رات گہری ہونے کے ساتھ خنکی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ درختوں کی شاخوں میں سے شوکتی ہوا موسم کو مزید اداس کر رہی ہے سبز زرد اور جل کر بھورے ہوتے کئی پتے کوئلوں کی آنچ میں چرمرا رہے ہیں۔ جب بھی دھویں میں خیالات کے ہیولے واضح ہونے لگتے ہیں سانسوں میں چیڑ کی مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔

میرے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے کچھ لمحوں کے لیے وقت زمین آسمان ساری کائنات اور میرا جسم تک منجمد ہو چکے تھے ـــــ تھے؟ نہیں ـــــ بلکہ وہ لمحہ تو آج تک منجمد ہے۔ وقت نے اس لمحے کو حنوط کر کے میرے دل کے نہاں خانوں میں بسا ڈالا ہے۔

پہلی نظر کی محبت میرے لیے ایک جگت بازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اپنے یار بیلیوں کی محفل میں میں بارہا ایسی محبتوں کا مذاق اڑا چکا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی میں خود بھی پہلی نظر میں یوں ڈھیر ہو جاؤں گا۔

وہ اس دنیا کی سب سے حسین لڑکی تھی یا کہ ساحرہ، جس نے مجھے جکڑ بندی کا شکار کر لیا تھا۔ کچھ خوبصورتیاں بیان نہیں کی جا سکتی صرف محسوس کی جا سکتی ہیں۔ کوئی بھی تشبیہ کوئی استعارہ کسی بھی شاعر کے اشعار صنوبر کی تصویر کشی نہیں کر سکتے۔ جیسے شدید سردی کے موسم میں کئی دنوں بعد سورج نکلے، اس کی نرم دھوپ محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن بیان نہیں کی جا سکتی۔ کتنی ہی دیر میں گرد و پیش سے بے خبر کالج روڈ پر سینیٹری فٹنگز کی ایک دکان کے سامنے کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب محویت ٹوٹی تو احساس ہوا کہ وہ سارا منظر نامہ محض خالی فریم رہ گیا تھا۔ سڑک کنارے لگے درخت، کالج سے نکلنے والے

اسٹوڈنٹس کا ہجوم، راہگیر شاید سبھی اُسی سمت روانہ ہو چکے تھے۔ اور میں اس خالی فریم میں جکڑا بل کھاتی سڑک پر کھڑا کسی روح سے پھونک دیا گیا تھا۔

جلتی لکڑیوں کے چٹخنے سے اڑنے والا شرارہ میری ہتھیلی کی پشت پر آن گرا ہے۔ ہاتھ میں تھمے کاغذ میں ایک سوراخ بھی ہو چکا ہے۔ یہ آگ کتنی بے مہر ہے یہ نہیں جانتی کہ کیا کچھ جلا رہی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں بھی ابراہیم نہیں ہوں مگر پھر بھی۔

تب سردیوں کی آمد آمد تھی چناروں کے پتے چنگاریوں کی مانند سرخ ہو چکے تھے مگر صنوبر کے درخت یادوں کی طرح ہمیشہ ہریالے رہتے ہیں۔ اس شام مجھے واپس گوجرانوالہ آنا پڑا۔ مگر اگلے دن صبح صادق کے ساتھ ہی میں نے پھر جی ٹی روڈ سے ہوتے ہوئے کشمیر ہائی وے کا رخ کیا۔ راستوں کے منظر سڑک کنارے لگے سنگ میل اور فاصلہ سب سمٹتے جا رہے تھے۔ دوپہر تک کالج کے سامنے میں گیان کی تلاش میں تپسیا کرتے کسی بدھ بھکشو کی مانند اس کا انتظار کرنے لگا۔

وجدان کی مانند نازل ہونے والی محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ کسی نہ کسی سطح پر میری اور صنوبر کی روحیں کسی نامعلوم مقام پر مقناطیسی فیلڈ میں داخل ہو چکی تھیں۔ جیسے ایک قطب نما زمین کی مقناطیسیت کو پہچانتا اور اپنا رخ قطب کی طرف متعین کر لیتا ہے۔ ایسے ہی میں کسی قطب نما کی مانند ہمیشہ کے لیے اس کے پیچھے ہولیا۔

صنوبر کا باپ میرا پرانا کسٹمر تھا۔ پچھلے دو سال سے وہ میری دوکان سے سینٹری کا سامان کشمیر منگوا رہا تھا۔ میں نے ایک گہری اور پرسکون سانس لی کہ اب صنوبر سے رابطہ اب اتنا مشکل نہیں رہے گا۔

چھت کی طرف آنے والی سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ یہ میری بیوی سمیرا ہے۔ میرے پاس اسے وضاحت دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ شاید میرے سارے لفظ کہیں خرچ ہو گئے ہیں یا اپنی بے وقعتی سے خود بھی واقف ہیں۔ وہ آئے گی مجھے دیکھے گی، شاید غصہ کرے گی یا بغیر کچھ کہے واپس چلی جائے گی۔ دھواں

میری آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہا ہے۔ سامنے موجود سارے منظر گڈمڈ ہو چکے ہیں۔

صنوبر اپنے کالج کے لانگ ٹرپ پر اسلام آباد آئی تھی۔ فون پر رابطے کے بعد وہیں سے ہماری باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کئی مہینوں تک یہ سلسلہ کسی پارک اور کبھی کسی ریسٹورینٹ میں اس کے گھر والوں سے چھپ کر جاری رہا اور میرے گھر والوں کو تو یہی پتا تھا کہ کشمیر میں میرا کاروبار بہت پھیل رہا ہے۔ آئے دن فاصلے سمٹتے تین پہر کا سفر میرے لیے صرف ایک گام کی دوری پر ہوتا۔

محبت کے شجر پر سرخوشی اور چاہے جانے کا نشاط اکیلا نہیں کھلتا، ساتھ خوف، وسوسوں اور اندیشوں کی زہریلی بوٹیاں بھی سر اٹھانے لگتی ہیں۔ صنوبر نے میری منتیں کیں کہ کورٹ میرج کے بعد اسے ساتھ گوجرانوالہ لے جاؤں کیونکہ اس کے والد کبھی اپنی ذات برادری سے باہر اس کا رشتہ طے نہیں کریں گے۔ ہوسکتا ہے اسے جان سے ہی مار ڈالیں۔ مگر نجانے کیوں میں ضرورت سے زیادہ اعتماد کا شکار رہا کہ ہماری شادی گھر والوں کی مرضی سے ہو جائے گی۔ میں سوچتا کہ آخر ایک مستحکم اور اچھے خاندان کے لڑکے کا رشتہ جسے ان کی بیٹی بھی پسند کرتی ہے محض ذات پات کی وجہ سے کیسے رد کر دیا جائے گا؟

میں اگر جامن کا پیڑ تھا تو صنوبر کا باپ چیڑ کا اونچا مضبوط اور سخت جان درخت۔ مجھے ہواؤں کو سینے پر روکنے کا مان تھا تو چیڑ کے درخت نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا تھا۔

میری اور صنوبر کی محبت زیادہ دنوں چھپی نہ رہ سکی ایک دن اُسے کالج واپس چھوڑ رہا تھا کہ سامنے اس کا باپ راجہ پرویز خان کھڑا مل گیا۔ صنوبر کا گلابی رنگ پیلا پڑ گیا، وحشت زدہ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں لیے کانپتا وجود خزاں رسیدہ پتوں کی مانند لرزنے لگا۔ پرویز خان نے مجھے کھا جانے والی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اگر دوبارہ اس شہر میں نظر آئے تو کاٹ ڈالے جاؤ گے۔

ایک اور خط میں آگ میں جھونک چکا ہوں، صنوبر کی تصویر سرخ کوئلوں پر دہک

رہی ہے۔ جلتے ہوئے کاغذ میں سے بھی اس کی سبز آنکھیں مجھے تحیر اور بے یقینی سے دیکھ رہی ہیں۔ سمیرا کو جانے کیوں مجھ پر یقین نہیں آتا۔ یہ سارے خطوط صنوبر کی تصویریں میں نے گھر میں بنے ایک لاکر میں چھپا کر رکھی تھیں۔ پتا نہیں اس کو کس نے بتایا تھا۔ یا شک بیویوں کے خمیر میں رچا بسا ہوتا ہے کہ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد صنوبر کی تصاویر اور خطوط سمیرا کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ پہلی بار تو سمیرا بھی صنوبر کی تصویر دیکھ کر دم بخود رہ گئی پھر پرائی عورت سے جلن کا احساس ہماری زندگی میں زہر گھولنے لگا۔ ایک عورت دوسری عورت کا سایہ تک برداشت نہیں کرتی اور یہاں تو میں خود صنوبر کے وجود کی ایک پرچھائیں بن کر رہ گیا تھا۔

صنوبر کا وہ کالج میں آخری دن تھا اس کے چاروں طرف پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ فون مسلسل بند رابطے کی کوئی صورت نہ بچی تھی۔ چھپتے چھپاتے مظفرآباد پہنچا، صنوبر کی ایک سہیلی کی وساطت سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو علم ہوا کہ کالج چھڑوا دینے کے بعد صنوبر کی شادی بھی طے کر دی گئی ہے۔

کچھ دنوں بعد میرے تایا زاد بھائی کو پرویز خان کا پیغام آیا کہ تمھارا چچیرا بھائی اگر پیسوں کی اگرائی کرنے بھی یہاں آیا تو کاٹ ڈالا جائے گا۔ میرے ذمے اس کے تین چار لاکھ روپے ہیں جلد ہی سارا حساب تمھارے ہاتھ چکتا کر دوں گا۔ مگر وہ اپنی شکل لے کر کبھی یہاں نہ آئے۔

چیڑ کا پیڑ بہت اونچا سخت اور جاندار ہوتا ہے برفانی طوفان بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے وہ پہاڑوں کا پروردہ تھا، بھلا اسے میں کیسے زیر کرتا۔

معاملہ میرے گھر والوں تک پہنچا۔ یار بیلی مذاق اڑانے لگے کہ ہمیں کانوں کان خبر کیوں نہ ہونے دی اور معاملہ عشق میں اتنی اونچی اڑان پر چلا گیا۔

میرا وجود یخ بستہ ہواؤں کی زد پر تھا۔ کئی بار ایسا لگتا کہ ایک ایک کر کے میرے سارے ٹہن ٹوٹ جائیں گے۔ بے قراری سی بے قراری تھی۔ میری بے چینی دیکھ کر

دوست کہتے یہ سب نارمل ہے ہر شخص عمر کے اس دور میں ان کیفیات سے گزرتا ہے۔ چھوڑو ٹینشن کوئی نئی لڑکی پھانسو بھول جاؤ گے اسے، لڑکی تو لائف میں آتی جاتی رہتی ہے۔ بلکہ بندہ اپنا ٹیسٹ بدلتا رہے تو اچھا ہے۔

کچھ مہینوں کی اداسی اور سٹریس کے بعد میں نے دھیان ہٹانے یا شاید دوستوں کی نصیحت آزمانے کو بیک وقت دو تین لڑکیوں سے دوستی بھی کر لی۔ چلو یونہی سہی کچھ زندگی کا دستور تو بدلے۔

آگ بجھنے لگی ہے میں ایک خشک ٹہنی سے کوئلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ مزید خشک پتے اور ٹہنیاں ان کوئلوں پر رکھ دیے ہیں۔ ابھی تو کئی ورق جلانا باقی ہیں۔

یار تو شادی کر لے یا کہیں ریلیشن بنا لے۔ یہ پیار محبت کچھ نہیں، صرف جسم کا تقاضا ہے پورا ہو جائے گا تو سب بھول جائے گا تجھے۔

روز میرا دوست یہی نصیحت کرتا۔ لیکن نئے افیئر چلا لینے کے بعد بھی بے قراری جوں کی توں رہی۔ میں نے کبھی صنوبر کو چھوا تک نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ شادی کے پلان بناتا بچوں کے نام تک سوچتا لیکن شادی سے قبل جسمانی تعلق کا خیال کبھی دل میں نہ آیا۔ شاید ماحول یا تربیت کا اثر یا پھر اسی کے سنگ زندگی گزارنے کا پکا تہیہ جو تھا۔ میری حسیات کتنی کمزور تھیں جو یہ اندازہ ہی نہ لگا سکیں کہ وصال سے قبل ہی دائمی ہجر کا روگ لگے گا۔

دوستوں کی نصیحتوں کے بعد کئی اور لڑکیوں کے قریب ہوا کہ اگر لمس سے محبت کی تڑپ ختم ہو جاتی ہے تو میں بھی اسے بھلا سکوں گا۔

لیکن یہ سب ڈھکوسلے ہی رہے۔ نہ تڑپ ختم ہوئی نہ ہی ہجر کا روگ۔ ماں کو سب باتوں کی سن گن ملی تو اس نے میرے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ کشمیر اور شمالی علاقوں کی طرف سے آنے

والی یخ بستہ ہواؤں نے میرے جسم میں سنسناہٹ بھر دی ہے۔ میری آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی ہیں۔ کوئلوں میں دہکتے خطوط، سمیرا کی شکایتی نظریں۔ صنوبر کا صبیح چہرہ سبز انکھیں سب گڈ مڈ ہو رہے ہیں۔

کاش میں کمزور ٹہنوں والا جامن کا اونچا درخت نہ ہوتا۔ کاش میں آندھیاں اپنے سینے پر روکنے کا وصف رکھتا۔

مجھے خود سے بہت شکایات ہیں۔ میں نے صنوبر کی بات کیوں نہ مانی؟ میں پرویز خاں سے کیوں ڈر گیا؟ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی محبت کا اقرار کرنے کی بجائے، صنوبر کا ہاتھ مانگنے کی بجائے اپنی جان کے ڈر سے چھپ کر بیٹھ گیا۔

اگر میں نے یہی کم ہمتی دکھانا تھی تو کیوں صنوبر سے عہد و پیمان باندھے؟ کیوں اس کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور اس حد تک لے گیا جہاں اس نے واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ چنا۔

میری شادی ہوگئی۔ سمیرا ویسی ہی بیوی ہے جیسی سب بیویاں ہوتی ہیں۔ دو بچے بھی ہو گئے جسم کی بھوک پیاس سب مٹا چکا ہوں مگر روح کی تشنگی ہے کہ مٹتی نہیں۔ دل کا جان لیوا درد ہے کہ مجھے کسی پل قرار نہیں۔ اپنی بیوی کی قربت میں ہوں یا دوستوں کی محفل میں، کہیں کوئی کانٹا مسلسل مجھے کچوکے لگاتا رہتا ہے احساس کی شدت ہے جو کاٹتی رہتی ہے۔

کیا واقعی مرد اپنی محبت میں ناپختہ ہوتا ہے۔ اگر اِس کی محبت خام ہی ہوتی ہے تو پھر میں خود کو نزاع کے عالم میں کیوں پاتا ہوں۔

ساری ٹہنیاں جل چکی ہیں۔ اب فقط راکھ بچی ہے ساری تصویریں سارے خطوط راکھ کر چکا ہوں کہ کم از کم سمیرا کو تو راضی رکھ سکوں۔ لیکن ان میں لکھا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہے۔ اس کی صورت کی شبیہ میری آنکھوں میں بسی ہے یہ فرار تو فقط ایک خود فریبی ہے۔

کاش صنوبر اپنی شادی کی رات زہر کھا کر خودکشی نہ کرتی۔ وہ جیتی رہتی بے شک کسی اور کی ہم سفر بن کر جیتی۔ کسی موٹے سیٹھ یا گنجے سرکاری ملازم کے بچے پیدا کرتی۔ انھیں بڑا کرتی آنکھوں میں کچھ الگ خواب بساتی اور میرے دل میں جب کبھی اس کا خیال آتا تو میں اس کے تصور سے مسکرا دیتا۔ اس کی خوشیوں کی ہمیشگی کے لیے تمنا کرتا۔ اس دنیا کے کسی کونے میں سہی کسی اور کے پہلو میں سہی لیکن وہ موجود تو ہوتی مگر اس نے میری محبت میں موت کو گلے لگا لیا۔ میری جدائی میں جینا گوارا نہ کیا اور میں۔۔۔۔ میں ضمیر کی ملامت اور ماضی کے پچھتاؤں کے ساتھ جی رہا ہوں۔

جامن کے سارے ٹہن ٹوٹ گئے تھے وہ اپنے سینے پر آندھیوں کو نہ روک پایا۔

دور بہت دور چیڑ کا فلک بوس، ہرا بھرا مغرور درخت جو برف کے طوفانوں میں جیتا تھا اپنی انا کی اونچائی میں حد سے گزرنے کے بعد اوپر سے جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

جامن اور چیڑ دونوں سینکڑوں میل کی مسافت پر گڑے ایک دوسرے سے نظریں چرائے آج بھی ایستادہ ہیں۔ ادھورے اور محروم شجر۔

تلاش

وہ ایک شاعر اور مصور تھا جو بھٹکتا ہوا اُس بستی میں آن پہنچا تھا جہاں اس کے اطراف میں موجود کل کائنات مٹی دھول اور اندھیروں سے اٹی تھی۔ اس کے ارد گرد نہ تو حسین چہرے تھے اور نہ ہی رنگا رنگ فطری مناظر جنھیں وہ کینوس پر اتار لیتا۔ اس نے اپنی تصویروں میں گرد آلود پاؤں، سوکھے پھول خاردار جھاڑیاں، خالی ڈبے، ٹوٹے ہوئے بنچ اور گہری رات کا سکوت پینٹ کر دیا۔ اپنے شعروں میں کھوٹے سکوں، جانوروں، کالے بدشکل اور محروم انسانوں کے قصیدے لکھ ڈالے۔ اس نے ایک پرانے کھمبے کی مدھم ہوتی روشنی میں بیٹھ کر تصویریں بنائی تھیں، وہ کھمبا اس کا ہم راز تھا۔ مناسب دیکھ بھال اور گھاس پھوس سے محروم باغ کے جس بنچ پر وہ بیٹھا کرتا تھا وہ بھی اس کا رفیق بن چکا تھا۔

اس کی زندگی میں اس کی پینٹنگز کبھی نہ بک سکیں نہ ہی کوئی اس کے اشعار کا مداح پیدا ہوا۔ وہ کاغذوں میں پڑا رہا اور وقت کی دیمک ایک دن اُسے نگل گئی۔

کچھ عرصہ بعد بستی کے لوگوں نے اُس پرانے کھمبے کو جو زنگ آلود ہونے لگا تھا، اکھاڑ کر فونڈری میں گلا دیا گیا۔ اس کی دھات سے تار بنائے گئے اور اُن تاروں کو پھر مختلف سازوں میں جوڑ دیا گیا۔ بعد مدت کے ہر تار سے اُس شاعر کے نغموں کی اداس دھنیں گونجیں اور سماعتوں کو نئے ذوق سے ہم کنار کر گئیں۔ باغ میں پڑے لکڑی کے

پرانے بینچ پر پرندوں کی ٹولیاں اُتر کر بیٹھنے لگیں اور اس کی تصویروں کو نئی معنویت عطا کرنے لگیں۔ لوگ یہ سب منظر دیکھتے حیران ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس کی تمام پینٹنگز کھوجی گئیں اور عجائب گھروں کی زینت بنیں۔ خستہ کاغذوں پر لکھے اس کے اشعار زبان زدِ عام و خاص ہوئے۔ کینوس کے قطعات پر بنے مناظر ایک دوسرے کو کئی سوالیہ نشان لیے تکتے اور کاغذوں میں لکھے الفاظ آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ آخر لوگوں کو اس فنکار کے مرنے کے بعد ان کاغذ کے ٹکروں اور کینوس کے قطعات میں کس شے کی تلاش ہے؟ شاید آرٹسٹ کی موت کی۔

خوارزم کے نمکین آنسو

نیبوکوف گہری نیند سے اٹھا تو اپنی خشک آنکھیں ملنے لگا۔ اس رات پھر اسے خواب میں ماہی گیروں کی کشتیاں مستول اور لنگر نظر آئے تھے۔ کشتی کے نچلے حصے میں برف اور نمک کے آمیزے سے محفوظ مچھلی کی بو خواب سے بیدار ہو جانے کے بعد بھی اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ کروٹ بدل کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔
نیبوکوف فری لانس فوٹو گرافر تھا۔ وہ کئی ہفتوں سے ایک اخبار کے لیے ڈیموں کی افادیت اور ماسکو کی آبی پالیسیوں بارے جاری پروجیکٹ کی تصویری عکاسی کر رہا تھا۔
اسی پروجیکٹ کے دوران اسے دس سال قبل اَرل جھیل کی ساحلی بستیوں میں گزرا وقت بہت یاد آنے لگا تھا۔ چند روز سے وہ مسلسل خواب میں ماہی گیروں کی کشتیوں نمکین ساحلوں اور اپنے پرانے دوست زولفیزار اور ڈی نیزا کو دیکھ رہا تھا۔ اخبار کی طرف سے معاوضے کی رقم ملتے ہی اس نے ازبکستان کی فلائیٹ لی اور اپنے پرانے ماہی گیر دوستوں سے ملنے چلا گیا۔
زولفیزار اور ڈی نیزا اسے اپنی بستی کے اسٹیشن پر خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ اُسے ان دونوں کی حالت دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ ان کے بالوں کی رنگت اڑی ہوئی، جلد چمڑے کی مانند خشک اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی پشت پر ایگزیما کے زخموں کے نشان نمایاں تھے۔

یہ کیا ہوا تمھیں زولفیزار؟

نیبوکوف تم فش ہاربر تک آؤ سب معلوم ہو جائے گا۔

ہاں زلفے میں آرل جھیل میں ڈولتی کشتیوں اور پس منظر میں غروب ہوتے سورج کی عکاسی کرنے کے لیے بیتاب ہوں۔

کچھ ہی دیر میں وہ پرانے ہاربر پر آن پہنچے۔

نیبوکوف اپنے دوستوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا لکڑی کے بوسیدہ تختوں پر آگے بڑھا تو اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹنے لگیں۔

دور حد نظر تک ریت اڑ رہی تھی۔ کئی کشتیاں آدھی ریت میں دھنسی ہوئی تھیں اور کئی کشتیوں کے لنگر بھی ریت کے ژولیدہ لہریوں میں سے جھانکتے نظر آ رہے تھے۔ پھیکا زرد سورج گرد کا غلاف اوڑھے ارلکم صحرا میں آگ برسا رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا ویران فش ہاربر میں ریت کے بگولے آسیبوں کی طرح رقصاں تھے۔ دور دور تک پانی کا نام ونشان نہیں تھا فقط اس کی سرخ آنکھوں میں دو نمکین آنسو تیر رہے تھے۔

دریاچہ خوارزم کے نمکین آنسو.....

اضافت

چونے اور پتھر سے تعمیر شدہ صحرائی گھر کی ہر درز سے زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔ گھر کے باہر بڑھیا اپنی کرسی پر بیٹھی کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ بڑھیا کے سامنے مکان کے داخلی دروازے کی دوسری جانب ایک خالی کرسی بھی دھری تھی۔ وہاں سورج کی مہربان اجلی دھوپ زندگی کی حرارت کا احساس دلا رہی تھی اور تازہ ہوا گنگناتی ہوئی گزرتی تو گوشے گوشے کو معطر کر دیتی۔ اسے یاد آیا ایسی ہی ایک بڑھیا کہانیوں میں چاند پر سوت کاتا کرتی تھی۔ کہیں یہ وہی بڑھیا تو نہیں۔ وہ اس وادی میں جہاں وقت بھی دبے پاؤں چلتا تھا خاموشی سے مکان کی جانب بڑھا تاکہ اُس بڑھیا سے تکلے کی سوئی سے لے کر چاند گرہن تک کی ہر الف لیلوی داستان سن لے۔

مگر اس وادی کی جانب قدم بڑھاتے ہی سارا منظر بدل گیا۔ گویا کچھ شرارتی بچوں نے افق کے دونوں کناروں کو تھام کر جھولا جھلانے والی چادر کی مانند اوپر اٹھا لیا ہو۔

ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر اس نے زور سے آنکھیں ملیں اور پھر حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک فلک بوس عمارت کے اوپر موجود تھا چاروں طرف آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنیاں فلک پر پھیلے ستاروں کے زمین سے محوِ کلام ہونے سے مانع تھیں اور مدھم سا چاند بہت پھیکا لگ رہا تھا۔ اس نے جنگلے کے ساتھ کھڑے کھڑے سر

جھکا کر نیچے دیکھا تو چکرا کر رہ گیا۔ بہت نیچے سڑکوں پر ٹریفک جگمگاتی روشنیوں کے نقطوں کی مانند تیزی سے دونوں سمتوں میں بہتی نظر آ رہی تھی اور گھڑی کی سوئیاں اتنی تیزی سے چل رہی تھیں کہ اسے بالوں میں اترتی سفیدی کا بھی احساس نہ ہوا۔

سبین علی اپنے تخلیقی رویے میں قدرے مختلف نظر آتی ہیں۔ موضوع کے تنوع اور عصری مسائل کے ساتھ ان کے افسانے علامات اور استعارات کی نئی جہت سے آشنا کراتے ہیں۔ ان کے افسانے موضوع کے اعتبار سے اپنا اسلوب خود گڑھتے ہیں۔ یہ کبھی وضاحتی طرزِ بیان سے کام لیتی ہیں، کبھی استعاراتی نظام کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اساطیر کے بطن سے بھی یہ کامیاب افسانے کی بازیافت کا فن جانتی ہیں۔ یونانی دیومالا کے پس منظر میں سانس لیتا ہوا افسانہ ''ایتھنے اور سموں'' بین الاقوامی اثرات کا اشاریہ ہے کہ کس طرح عام بنکر کے صدیوں کا ہنر صارفی کلچر کی نذر ہو گیا ہے۔ افسانہ ''کتن والی'' میں بھی جولاہن کا عبرت ناک حشر عام بنکروں کے استحصال کا نوحہ بیان کرتا ہے۔ ''کلمہ و مہمل'' صرف کمیونیکیشن گیپ کا افسانہ نہیں ہے بلکہ سبین کی تانیثی فکر کا آئنہ دار بھی ہے۔ افسانہ بصارت پر سماعت کی فوقیت کا سوال قائم کرتا ہے۔ ایک گونگی بہری نسوانی کردار کی پیکر تراشی میں سبین معاشرے میں رینگتے سانپوں سے خود کو بچاتی معذوری جسم کے ساتھ جیتی ہوئی لڑکی کو ایک بہتر زندگی جینے کا حوصلہ بخشتی ہیں. افسانہ ''ان ٹیوشن'' انسانی زوال کا المیہ ہے جہاں انتہائی کرب سے گزرنے کے بعد تخلیق وجود میں آتی ہے اور کچرے میں ڈال دی جاتی ہے. سبین نے نفسی محرکات اور رشتوں کی تجدید سے اردو افسانے کو نیا فلسفیانہ آہنگ بخشتا ہے.

شموئل احمد

تازہ ہوا بہار کی ۔۔۔محمود احمد قاضی

یہ بات طے ہے کہ فکشن لکھنے والا تب تک فکشن نگار نہیں بنتا جب تک کہ یہ اس کے خون میں نہ رچ بس جائے۔۔ یہ اتنا آسان کام ہوتا تو ہر کوئی منٹو۔۔ موپساں۔۔ یا دوستوفسکی کہلاتا۔

لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ میں جب ماضی کے پی ٹی وی کے معیاری ڈرامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے نئے فنکاروں کو مختلف چینلز پر نعمان اعجاز اور ثانیہ سعید کے روپ میں دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کہ فن کا سفر بڑے اچھے ڈھنگ سے اب بھی جاری ہے۔

سبین علی فکشن کا نسبتا ایک نیا نام ہے۔ وہ گُلِ مصلُوب کے نام سے افسانوں کا جو پراگا ہمارے سامنے لائی ہے اسے پڑھتے ہوئے اس کے افسانے ""چیونٹیاں"" کی چیونٹیاں ہماری فکر کی کمر پر رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور اس کی "" کتن والی"" ہمارے من اندر بیٹھ کر چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ مطالعہ، پرکھ اور مشاہدہ جن تین چیزوں کا ایک لکھنے والے کے پاس ہونا ضروری ہے وہ سبین کے پاس بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس سے مستزاد اس کا ادراک اور احساس بھی اس کے ذہنی خزانے میں شامل ہے۔ یہ بات اسے یہ اعزاز عطا کرتی ہے کہ وہ محاذ پر لڑنے والے سپاہی اور ایک جولاہی کے بھیتر میں اتر سکے اور پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے کر چل سکے۔ سبین کے پاس وہ فنی چقماق موجود ہے جس کی کہ ہم سب لکھنے والوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ سبین اگر اسی ڈگر پر چلتی رہی تو ایک سنجیدہ اور تہہ داری پر مبنی فکر کی حامل فنکارہ کے طور پر ضرور ابھر کر سامنے آئے گی۔

محمود احمد قاضی

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com